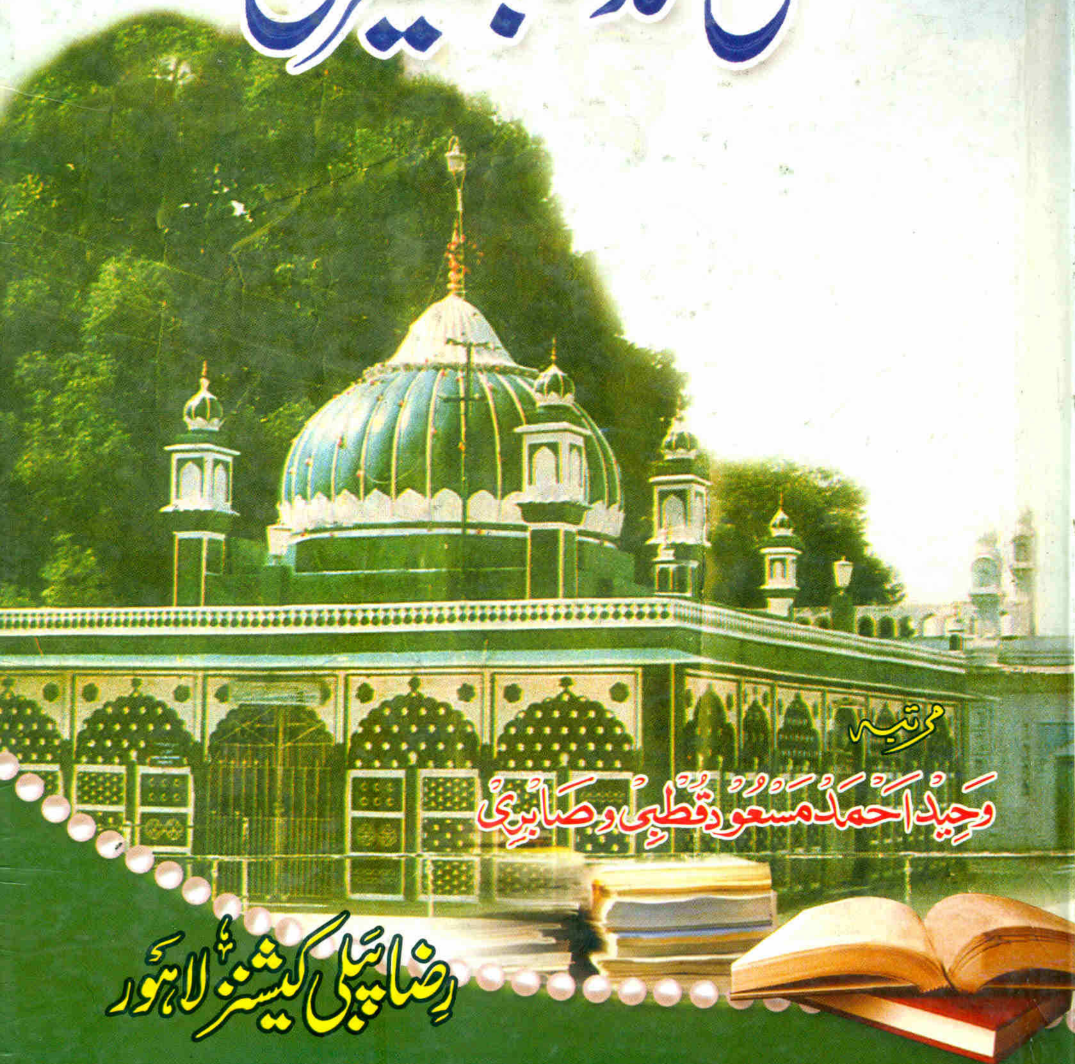
حضرت مخدوم علاء الدین علی احمد صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ



مرتبہ
وحید احمد مسعود قطبی و صابری

رضا پبلی کیشنز لاہور

حق

سوانح

حضرت مخدوم علاء الدین مسا

حق حق

علی احمد صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ

مرتبہ

وحید احمد مسعود قطبی و صابری

رضا پبلی کیشنز ○ لاہور

گنج بخشِ فیضِ عالم مظہرِ نُورِ خُدا
ناقصاں را پیرِ کامل، کاملاں را راہنما

نام کتاب :۔ سوانح حضرت مخدوم علاء الدین علی احمد صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ

مرتبہ :۔ وحید احمد مسعود قطبی، صابری

تحریک :۔ ـــــ حکیم اہلِ سُنّت حکیم محمد موسیٰ امرتسری

تعارف :۔ ـــــ پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری

پروف ریڈنگ ـــــ محمد عالم مختار حق

صفحات :۔ ـــــ ۱۹۲

سنِ اشاعت :۔ ـــــ 2003ء/1424ھ

ناشر :۔ ـــــ میاں زبیر احمد علوی گنج بخشی قادری ضیائی

تعداد :۔ ـــــ دو ہزار

نگران شعبہ نشر و اشاعت :۔ محمد ریاض ہمایوں سعیدی

مطبع :۔ ـــــ پرنٹ یارڈ ۔ ملک پارک بلال گنج لاہور

ناشر: رضا پبلی کیشنز ○ ۱۸۶۔ انار کلی۔ لاہور ۲

فہرست مضامین

انتساب

پیکر صبر و استقلال واجب الاحترام حکیم اہل سنت حکیم محمد موسیٰ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ کے نام جن کی صحبت کے فیض صحبت سے اس ناچیز نے نہ صرف کتاب کے ساتھ محبت کا سلیقہ سیکھا بلکہ کتاب کے سینے میں محفوظ علم کی نشر و اشاعت کا قرینہ بھی پایا۔ آپ کی نظر کیمیا اثر کا فیضان ہے کہ یہ علمی ارمغان قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ عنوان انتساب میرے لیے باعث فخر و ناز ہے۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

ناشر: میاں زبیر احمد علوی گنج بخشی قادری ضیائی

حضرت لاہور

تعارف

جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم ایم اے پی ایچ ڈی کراچی

حضرت بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں شیخ سلیم چشتی (فتح پور سیکری) عہد اکبری کے وہ بزرگ ہیں جن کے آستانہ پر اکبری جاہ و جلال بھی سجدہ ریز رہتا تھا۔ اکبر اعظم کا ولی عہد شہزادہ سلیم، ان کی دعاؤں کا ثمرہ تھا اور اس کی ابتدائی پرورش بھی ان ہی روحانی شیخ کے گھر میں ان کے زیر عاطفت ہوئی۔ شیخ سلیم چشتی کے داماد شیخ اعظم فریدی فاروقی بدایونی تھے جو اُرلا اور منونہ (متصل آنولہ) کے ٹھاکروں سے کسی مقابلہ میں ۹۹۱ھ میں شہید ہوئے۔

مغلیہ دور میں اس خاندان کے کئی ارکان اعلیٰ عہدوں اور مناصب پر فائز رہے اور ان سے وفاداریاں اور جاں نثاریاں ظہور میں آئیں قطب الدین کوکلتاش، نواب فرید، شیخ ابراہیم کشور خاں اور شیخ الہ دیا اخلاص خاں اسی زمرے میں آتے ہیں۔

انگریزی دور میں بھی اس خاندان کا اعزاز و احترام باقی رہا۔ شیخ شرف الدین اس خاندان کے وہ بزرگ تھے جنہوں نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں بدایوں کے کلکٹر ایڈورڈ کی مدد کی اور اس کو چھپائے رکھا جس کے صلہ میں اعزاز و اکرام اور انعام و خطاب سے سرفراز ہوئے۔ سر سید احمد خاں نے شیخ صاحب کے حالات و خدمات کا مفصل ذکر "لائل محمڈنس آف انڈیا" میں کیا ہے۔ شیخ شرف الدین کے ایک صاحبزادے شیخ امیر احمد تھے جن کے صاحبزادے (۱) خان بہادر شیخ سید محمد (۲) شیخ وحید احمد اور (۳) خانصاحب شیخ محب احمد سے تھے۔

شیخ وحید احمد کا اصلی نام وحید محمد تھا لیکن وحید احمد عرف وحید میاں کے نام سے مشہور ہوئے آخر میں اپنے نام کے ساتھ مسعود کا اضافہ کر لیا تھا۔ وہ ۱۸ مارچ ۱۸۹۳ء کو شیخوپور (ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ حسب رواج ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ عربی و فارسی سے تعلیم کا آغاز ہوا۔ مولوی حامد علی اور مولوی احمد الدین صاحب (مدرس مدرسہ شمس العلوم بدایوں) کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ وحید میاں کی طبیعت کا رجحان درس نظامی کی طرف تھا اور وہ عربی زبان و علوم کی باقاعدہ تحصیل کرنی چاہتے تھے مگر ان کے بھائی سید محمد عرف میکو میاں نے انگریزی تعلیم کی طرف زور دیا اور وحید میاں ۱۹۰۴ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول بدایوں میں داخل ہو گئے پھر وہ علی گڑھ چلے گئے اور وہاں آٹھویں درجہ میں داخلہ لیا لیکن اتفاق سے کسی ساتھی کے چیچک نکل آنے کی وجہ سے عارضی قواعد و قیود سے پریشان ہو کر گھر آ گئے اور پھر مراد آباد کے اسکول میں داخل ہوئے مگر علالت کی وجہ سے شریک امتحان نہ ہو سکے بالآخر علی گڑھ سے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد میجر سید حسن بلگرامی (ف ۱۹۴۰ء) کے کیمبرج اسکول (علی گڑھ) میں داخل ہوئے جو جعفر منزل میں کھولا گیا تھا۔

وحید میاں کی دلچسپی ٹیکنیکل مضامین میں بدرجہ غایت تھی لہٰذا ان کے اساتذہ نے مشورہ دیا کہ وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ جائیں چنانچہ ۱۹۱۴ء میں وہ لندن پہنچ گئے لیکن کیمبرج اسکول (علی گڑھ) کے زمانہ کا ایک واقعہ خاص طور سے قابل ذکر ہے جس سے ان کے مزاج اور آئندہ کے عزائم کا اظہار ہوتا ہے ۱۹۱۳ء میں کانپور کی مسجد کے ایک حصہ کے انہدام کا مشہور حادثہ فاجعہ ظہور پذیر ہوا بہت سے مسلمان شہید ہوئے اور ملک میں ہنگامہ برپا ہو گیا اس وقت صوبہ یو۔پی کا گورنر مسٹن تھا وحید میاں نے ایک مضمون بعنوان "مُستان کے نام کھلا خط" لکھا۔ مسٹن کو "مستان" لکھ کر خوب کردار نگاری کی۔

وحید میاں کے لندن پہنچتے ہی جنگ عظیم اول (۱۹۱۴ء — ۱۹۱۸ء) کا آغاز ہو گیا۔ لہٰذا ان کے گھر سے واپسی کے تقاضے شروع ہو گئے۔ انہوں نے لندن کی بجائے مانچسٹر کے ایک ٹیکنیکل اسکول میں الیکٹریکل ڈپلومہ کے حصول کے لئے داخلہ لے لیا مگر وہاں کچھ ایسے حالات اور پیچیدگیاں رونما ہوئیں

کہ انہوں نے مانچسٹر کے اسکول کو چھوڑ کر گلاسگو کی راہ لی اور ایک ٹیکنیکل انسٹیٹیوٹ میں داخل ہو گئے ۱۹۱۶ء میں چھٹیاں گزارنے کے لیے وہ گھر (شیخوپور) آئے لیکن گھر والوں نے جنگ عظیم کی ہولناک فضا کی وجہ سے انہیں پھر واپس نہیں جانے دیا اور وہ اپنے نصاب کی تکمیل نہ کر سکے۔ انگلینڈ میں ان کا قیام تقریباً دو سال رہا۔

انگلینڈ سے واپس آنے کے بعد انہوں نے الیکٹریکل لائن میں بمبئی اور کانپور میں مزید تجربات حاصل کرنے کی کوشش کی مگر کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ ۱۹۱۸ء میں ان کے بھائیوں میں جائیداد کی تقسیم ہو گئی اور وہ کلی طور سے اپنے معاملات کے ذمہ دار ہو گئے۔

وحید میاں کی مثلث حیات کے مندرجہ ذیل تین زاویئے رہے

(۱) سیاست (۲) ادب (۳) تصوف

انہوں نے ایک قدیم زمیندار گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ریاست و امارت میں پلے بڑھے ان کا خاندان انگریزی حکومت کا خاص وفادار اور ممد و معاون رہا۔ خان بہادر کے خطابات اور آنریری مجسٹریٹی وغیرہ شیخوپور کے فریدی شیوخ کے لیے وقف تھی۔

خود وحید میاں کے بڑے بھائی میکو میاں خان بہادر اور چھوٹے بھائی محب احمد خاں صاحب کے خطابات اور آنریری مجسٹریٹی وغیرہ سے مفتخر تھے۔ وحید میاں کی آزاد طبیعت نے تحریک آزادی کے اکابر سے رشتہ جوڑا اور مولانا محمد علی و شوکت علی سے وابستگی رکھی۔ ۱۹۳۳ء میں وحید میاں یو۔پی کونسل کے ممبر رہے اور ۱۹۳۷ء میں بھی کانگریس کے ٹکٹ پر ایم۔ایل۔سی منتخب ہوئے اور کونسل کے وہپ کی حیثیت سے کام کیا۔

وحید میاں کبھی موج میں ہوتے تھے تو ان انتخابات کی کوششوں، ہنگاموں اور معرکہ آرائیوں کی دلچسپ داستان سنایا کرتے تھے ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں پیلی بھیت میں خاص معرکہ رہا اور نوک جھوک کے واقعات ظہور پذیر ہوئے مگر کامیابی وحید کو ہوئی ۱۹۴۶ء میں بھی وہ کانگریس کی طرف سے ممبر لیجسلیٹو کونسل منتخب ہوئے جب ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ملک آزاد ہوا تو بدایوں کی تقریبات میں وہ مہمان

خصوصی تھے انہوں نے پولیس گراؤنڈ میں پولیس کی سلامی لینے کے بعد وزیر اعلیٰ کا پیغام سنایا۔ وہ یو۔ پی کے وزیر اعلیٰ گوبند بلبھ پنت کی وزارت میں پارلیمنٹری سیکرٹری تھے۔

وحید میاں اپنی فائلیں خود دیکھتے تھے ان پر نوٹنگ کرتے تھے، بڑی حد تک فیصلے بھی کرتے تھے اور روز کا کام روز نمٹا لیا کرتے تھے دوسرے لوگ اس پر تعجب کرتے تھے۔ وحید میاں کے ایک دوسرے پارلیمنٹری سیکرٹری مولوی محفوظ الرحمٰن نامی (بہرائچ) کے حسن اخلاق اور کارکردگی کے بھی معترف تھے۔ نامی صاحب کے علم و فضل، دیانت داری اور تفقہ فی الدین کا ان کے دل پر گہرا اثر تھا، مولانا نامی نے ایک کامیاب عربی درس گاہ (بہرائچ) کے قیام کے ساتھ ساتھ قرآن اور عربی کی تعلیم و تدریس کے لیے ایک مکمل نصاب کئی جلدوں میں تالیف کیا تھا جس کا ایک ایڈیشن کراچی میں بھی شائع ہوا تھا۔

نامی صاحب کے ایک شاگرد مولانا خالد فاخری الہ آبادی ہمارے دوست ہیں۔ وحید میاں رفیع احمد قدوائی کی پارٹی کے آدمی تھے بدایوں اور اس کے نواح میں ۱۹۴۶ء سے فسادات کا سلسلہ شروع ہوا اور اس میں روز بروز تیزی اور وسعت ہوتی رہی۔ کوئی پرسان حال نہ تھا مسلمان ترک وطن پر مجبور ہوئے۔ شیخ محمد سلیمان مرحوم (ف ۱۹۶۳ء) نے فسادات بدایوں کی مکمل روداد "بدایوں ۱۹۴۷ء میں" لکھی ہے جس سے اس دور کی غارت گری اور ہولناکی کا اندازہ ہوتا ہے وحید میاں اس زمانہ میں پبلک کی کوئی مدد نہ کر سکے غالباً وہ بھی مجبور تھے البتہ شیخ محمد سلیمان کے لیے وہ ضرور ڈھال ثابت ہوئے۔ بدایوں کے کلکٹر طیحے۔ ڈی شکلا نے شیخ صاحب کو بند کرنے کا ارادہ کر لیا تھا مگر وحید میاں نے آڑے آکر کلکٹر کی غلط فہمیاں دور کیں اور محمد سلیمان کو بچا لیا۔ اس صورت حال سے وہ دل گرفتہ بھی تھے۔ شاید اسی لیے ۱۹۵۳ء کے انتخاب میں انہوں نے حصہ نہیں لیا۔

وحید میاں جس زمانہ میں پارلیمنٹری سیکرٹری تھے اس زمانہ میں انہوں نے علمی و ادبی اور وقتی مسائل پر خوب لکھا اور ریڈیو سے تقاریر بھی کیں۔ ان کی تین کتابیں (۱) تصوف کی اصلیت (۲) گمراہ اور

(۳) اسلام مشرق میں اسی دور کی یادگار ہیں۔

وحید میاں نے ادبی میدان میں نمایاں کام کیا وہ ایک صاحب طرز ادیب تھے۔ تاریخ و تحقیق کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ ان کا مطالعہ وسیع تھا۔ اردو، فارسی اور انگریزی زبانوں پر یکساں عبور تھا۔ انہوں نے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے خالص علمی و ادبی ماہوار رسالہ "نقیب" فروری ۱۹۱۹ء سے جاری کیا۔ اس کے صرف ۳۶ شمارے شائع ہوئے اور جنوری ۱۹۲۴ء کے بعد یہ رسالہ بند ہو گیا۔ اس کی عمر اگرچہ کم ہوئی مگر ادبی حلقوں میں دھوم مچ گئی اور آج بھی ادبی و تحقیقی تحریروں میں کہیں نہ کہیں "نقیب" مرحوم کا ذکر آجاتا ہے۔ اس رسالہ پر میر محفوظ علی، محمد عظمت اللہ خاں اور سلطان حیدر جوش جیسے صاحب طرز ادیبوں کے ادب و انشا کی چھاپ تھی اور اسے حسن قبول حاصل تھا۔ علامہ سلیمان ندوی مرحوم اس طرح رقم طراز ہیں[1]

"نقیب" کو ہر مہینے دل چسپی سے پڑھتا ہوں۔ نصیحت کا تلخ گھونٹ بآسانی انسان کے حلق کے نیچے نہیں اترتا۔ جب شوخی و ظرافت کی شکر میں اس کو ملفوف نہ کر لیجئے مگر اس میں بعض لوگ اس قدر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ متانت اور سنجیدگی کا ذائقہ اس میں باقی نہیں رہتا لیکن نقیب نے جس اسلوب ادب کا تتبع کیا ہے وہ اعلیٰ سنجیدہ شوخی اور بہترین مہذب و متین ظرافت کی مثال ہے۔ اس کی ہنسی زیر لب مسکراہٹ سے آگے نہیں بڑھتی اور بے باک لاابالیوں کے قہقہہ کی آواز نہیں بن جاتی۔ اہل دل اس کو سمجھ کر متبسم ہو جاتے ہیں اور ناشناس اس کو نہ سمجھ کر مکدر نہیں ہونے پاتے۔ ہماری زبان میں یہ صنف کلام ابھی ناپید ہے نظم میں لیجئے تو سودا و فغاں اور مصحفی و جرأت کے ہزلیات ہیں اور نثر جدید میں پنچ کی جلدیں مگر یہ زمین اصلاح و مرمت طلب ہے۔ سعدی سے بڑھ کر ہمارے بوڑھے ادیبوں میں کون ہوگا لیکن پند نامہ سعدی کے ساتھ ساتھ مطائبات

[1] مکتوب علامہ سلیمان ندوی بنام وحید احمد مدیر نقیب بدایوں (اپریل ۱۹۲۲ء)

سعدی کو فراموش نہ کرنا چاہیئے۔ اُردو میں جدید طرز پر لکھنؤ اور پٹنہ کے بعض انشا پردازوں نے داغ بیل ڈالی مگر وقت کی محفل نے ان کو داد دیدے کر تہذیب و متانت کی حد سے آگے بڑھا دیا۔ گو میں اپنے اندازِ عبارت میں ہیزم خشک ہوں کہ میرے اسلوبِ بیان کے لب پر کبھی مسکراہٹ ہی طاری نہیں ہوتی لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ کوئی اہم سے اہم اور سنجیدہ سے سنجیدہ موضوع نہیں جس پر نقیب کے طرزِ انشا کا قلم آسانی اور کامیابی کے ساتھ رواں نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے بدایوں کے مصنف[1] "تجاہل عامیانہ" کو دار المصنّفین کی طرح ایک "دار المتجاہلین" قائم کرنا چاہیئے ورنہ ڈر ہے کہ ان کے بعد یہ طرز ناپید نہ ہو جائے۔"

مصوّرِ فطرت خواجہ حسن نظامی یوں اظہارِ خیال فرماتے ہیں[2]

"نقیب ایسے وقت بولا جبکہ ہماری شاہانہ سواری کا جلوس خاک بسر ہو چکا تھا قافلہ کے نشان، خاک پر، اوراق تاریخ بنے ہُوئے پامال نظر آتے تھے منزل ہمارے کارواں کی پر چشم، پر آب تھی۔ نقیب رسالہ میں سات سو چھیاسی کا مضمون پہلی بسم اللہ صحیح ہے بہت خوب انداز ہے اور بہت ہی خوب عنوان ہے۔ اظہار مقصد کا فیشن اس سے زیادہ صاف سلیس اور پُرلطف عبارت میں ممکن نہ تھا۔"

"نُقیب" کو ہندوستان کے مشہور اور نامور ادیبوں اور شاعروں کا تعاون حاصل تھا ذرا فہرست ملاحظہ فرمایئے۔ علامہ اقبالؔ، اکبرؔ الہ آبادی، فصاحت جنگ جلیلؔ مانک پوری، مولانا محمد علی جوہرؔ، حسرتؔ موہانی، مہاراجا سر کرشن پرشاد شادؔ، خواجہ حسن نظامی، مولانا آزادؔ سبحانی، پروفیسر نواب علی، قاضی عبدالغفار، آصفؔ علی دہلوی، سید ہاشمی فرید آبادی، نیاز فتح پوری، عظمت اللہ خاں، چودھری محمد علی ردولوی، محفوظ الحق عظیم آبادی، کیفیؔ چریاکوٹی، عزیزؔ لکھنوی، شاہ علی احسنؔ مارہروی، سید ابو محمد ثاقبؔ کانپوری، حامد اللہ افسرؔ میرٹھی، ثاقبؔ لکھنوی، خان بہادر

[1] پیر محفوظ علی بدایونی [2] نقیب مارچ ۱۹۱۹ء۔

مرزا سلطان احمد، محویؔ لکھنوی، محشرؔ لکھنوی، احسنؔ سنبھلی، چودھری رحم علی ہاشمی وغیرہ وغیرہ۔

بدایوں کے اصحاب شعر و ادب بھی "نقیب" سے پُورا پُورا تعاون کرتے تھے اور ان کی تخلیقات بالالتزام شائع ہوتی تھیں مندرجہ ذیل نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

میر محفوظ علی، فانیؔ بدایونی، سلطانؔ حیدر جوشؔ، مولوی ابو الحسن، مولانا یعقوب بخش راغبؔ، سید عنایت احمد، قمر الدین احمد، محمد مبین نازشؔ، ابرار حسین قادری، سبطین احمد، امیر احمد امیرؔ (ٹونک والے) قاضی غلام امیر، ثاقبؔ بدایونی، سید ابن علی، وامقؔ بدایونی، چودھری محمد ابراہیم خلیلؔ، چودھری محمد اسماعیل سید محمد میکو میاں —— وغیرہ۔

نقیب کے خیر مقدم اور کامیابی کے بارے میں فاضل مدیر لکھتے ہیں[1]

"ہیچ میرز کا خیر مقدم جس محبت اور ہمت افزا تعریف کے ساتھ کیا گیا ہے اس کے شکریہ کے لیے خاکسار کو الفاظ تلاش کرنا گوگردِ احمر کی تلاش سے کم نہیں، سچ یہ ہے کہ اس تعریف کے مستحق دراصل نقیب کے فاضل مضمون نگار صاحبان ہیں جن کی بدولت یہ محبت کے ہار اور ہمت افزائی کے طرّے نصیب ہوئے۔"

اپنی کامیابی اور "نقیب" کی مقبولیت پر وحید میاں اس طرح رقمطراز ہیں[2]

"میرا ششماہی تجربہ اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ اگر کسی کام کو ہمت و استقلال سے شروع کیا جائے تو کوئی مشکل نہیں جو سنگِ راہ ہو اور کوئی مدد نہیں جو غیر متوقع اور غیر مترقب طریقہ سے نہ ملے اس کا ثبوت "نقیب" کے ہر صفحہ سے مل سکتا ہے۔"

شروع میں "نقیب" نظامی پریس بدایوں میں چھپتا تھا مگر ستمبر ۱۹۱۹ء سے "نقیب پریس" قائم ہو گیا تھا۔ اس پریس سے فانیؔ کا سب سے پہلا دیوان شائع ہُوا جس پر وحید میاں نے مقدمہ لکھا تھا۔ نقیب

[1] نقیب مارچ ۱۹۱۹ء، [2] نقیب اگست ۱۹۱۹ء

پریس کا ایک چھوٹا سا بُک ڈپو بھی تھا۔

نقیب پریس بدایوں سے اکبر الہ آبادی کا کلیات بھی شائع ہوا تھا۔ رسالہ "نقیب" کی بدولت اکبر الہ آبادی سے وحید میاں کے تعلقات قائم ہو گئے اور وہ ان کی خدمت میں حاضر بھی ہوئے چنانچہ لکھتے ہیں[1]

"نقیب جب سے وجود میں آیا ہے میں نے کوشش کی ہے کہ احباب کے لیے سفر سے تحفے لا کر پیش کیا کروں چنانچہ اس وقت بھی ایک تحفۂ سفر پیش کیا جا رہا ہے۔ میں الہ آباد گیا تھا اور یہ سوچ کر گیا تھا کہ سنگم ضرور دیکھوں گا، امرود ضرور کھاؤں گا اور خان بہادر سیّد اکبر حسین صاحب قبلہ کی قدم بوسی حاصل کر کے تمنائے دیرینہ ضرور پوری کروں گا دریائے گنگ و جمن کا سنگم نہ دیکھ سکا مگر جناب پنڈت موتی لال نہرو کے "آنند بھون" میں مہاتما گاندھی اور مولانا شوکت علی کے سنگم کے درشن کئے اس روز مہاتما گاندھی "تلک میموریل اسکول" کا سنگ بنیاد رکھنے والے تھے۔ امرود ضرور کھائے مگر اب تک حیرت ہے کہ شہرت کا باعث بدمزگی ہے یا گرانی، ممکن ہے کہ میرے عزیز دوست فخر الدین احمد صاحب بی اے نے جن کے یہاں میں مہمان تھا عمدہ امرود کھلا کر بدایوں کے پیڑوں کی وقعت میرے دل سے کم کرنی نہ چاہی ہو۔ سید صاحب قبلہ کی زیارت حاصل ہوئی وقت بے وقت بھی تھا اور کم بھی تاہم میری آرزو پوری ہو گئی۔ کم یوں کہوں گا کہ معلوم ہی نہیں ہوا کہ کیسے ختم ہو گیا۔

وحید میاں نے اپنی اس ملاقات کا ایک دلچسپ واقعہ ایک مضمون میں اس طرح نقل کیا ہے۔[2]

"اللہ مغفرت کرے، حضرت سید اکبر حسین صاحب الہ آبادی کی شخصیت بھی کتنی عجیب و عظیم تھی، کل کی سی بات ہے کہ میں ایک شام کو بعد مغرب اپنے کرم فرما مولوی

[1] نقیب نومبر ۱۹۲۰ء [2] وحید میاں کے ایک مضمون مرتبہ مارچ ۱۹۳۳ء سے مقتبس۔

قمر الدین صاحب بی۔ اے۔ ایل ٹی کی معیت میں ان کے سلام کو حاضر ہوا۔ نہایت تپاک سے پیش آئے، شمع منگوائی اور اپنی بیاض میں سے مسکرا مسکرا کر اپنا کلام سنایا۔ میں نے پنسل سے اشعار نوٹ کرنا چاہے تو قمر صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا "تمہارے پاس تو ہمارا یہ پورا دیوان موجود ہے"۔ جب شعر پڑھا۔

تہذیب مغربی میں ہے بوسہ تلک معاف
آگے جو اس سے بڑھئے، شرارت کی بات ہے

بے ساختہ میری زبان سے نکلا "یہ آپ نے کیسے لکھا"، فوراً دریافت کیا "کیا بات" اب مجھے اپنی حماقت آمیز جسارت کا احساس ہوا۔ اور ہکا بکا رہ گیا۔ نہایت اصرار سے کہنے لگے۔ "کہئے کہئے! کیا بات ہے"۔ طالب علمانہ گستاخی کی تو عادت تھی ہی، مجبور ہو کر کہہ بھی ڈالا (اور اب حماقت و افسوس ہے کہ کیوں کہہ ڈالا) کہ پکیڈلی سرکس کی لڑکیاں زیادہ دست درازی پہ کہا کرتی ہیں۔

سن کر بہت ہنسے اور فرمایا شاعر پر چودہ طبق روشن ہوتے ہیں وہ اپنے ہی واقعات نہیں لکھتا بلکہ دوسروں کے بھی واردات لکھا کرتا ہے۔

اکبر الہ آبادی مرحوم نے مدیر نقیب کے نام مندرجہ ذیل خط میں[1] نقیب کو ایک شعر میں یوں موضوع کیا ہے۔

"عزیز من سلمہ،

[1] نقیب اپریل ۱۹۱۹ء۔

کیا عرض کروں۔ دل و دماغ پر قابو نہیں، جن صاحبوں سے مراسم دیرینہ ہیں ان کی خدمت سے ہی قاصر ہوں۔ اللہ آپ کو کامیاب کرے۔

خطرہ ہوا جو قوم کو فوج رقیب کا
نکلا مقابلہ کو رسالہ نقیب کا

اکبر

۷ اپریل ۱۹۱۹ء

نقیب میں اکبر الہ آبادی کا کلام مسلسل شائع ہوا اور مولوی قمر الدین احمد بدایونی نے ایک طویل مضمون بعنوان "کلام اکبر پر ایک نظر" لکھا جو نقیب میں برابر شائع ہوتا رہا۔ اور ممکن ہے کہ ان کا یہی مضمون ان کی کتاب "بزم اکبر" کی تالیف کا محرک ہوا ہو۔

علامہ اقبال سے وحید میاں کے تعارف کا ذریعہ بھی نقیب ہوا۔ طرفین سے خط و کتابت رہی اور کبھی کبھی علامہ اقبال کا کلام "نقیب" میں اشاعت پذیر ہوتا۔ علامہ کے تین خط وحید میاں کے نام محفوظ رہ سکے جو اقبال نامہ حصہ اول صفحہ ۴۲۵ تا صفحہ نمبر ۴۲۸) میں شامل ہیں[1]۔ نقیب ستمبر ۱۹۱۹ء میں علامہ اقبال کے مندرجہ ذیل تین شعر بخط اقبال شائع ہوئے۔[2]

از من اے باد صبا گوئے بہ دانائے فرنگ
عقل تا بال کشود است گرفتار تر است
برق را ایں بہ جگر می زند آں رام کند
عشق از عقل فسوں پیشہ جگر دار تر است
چشم جز رنگ گل و لالہ نہ بیند ورنہ
آنچہ در پردۂ رنگ است پدیدار تر است

وحید میاں نے علامہ اقبال کے کسی شعر کو موضوع بنا کر مضمون لکھنا چاہا تو انہوں نے مندرجہ ذیل رباعی لکھ کر بھیجی کہ اس پر مضمون لکھئے۔[3]

۱؎ انوار اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار (اقبال اکیڈمی کراچی ۱۹۶۷ء) ص ۱۷۵

۱؎ ایضاً صفحہ ۱۷۵، ملاحظہ ہو پیام مشرق ص ۲۲۵ - ۲۲۶ -

۳؎ ایضاً ص ۱۷۶ -

تو اے کودک منش خود را ادب کن
مسلماں زادہ، ترک نسب کن
برنگ احمر و خون و رگ و پوست
عرب نازد اگر، ترک عرب کن

مزید تشریح کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں[1]

"اس زمانے میں سب سے بڑا دشمن اسلام اور اسلامیوں کا نسلی امتیاز و ملکی قومیت کا خیال ہے۔ پندرہ برس ہوئے جب میں نے پہلے پہل اس کا احساس کیا۔ اس وقت میں یورپ میں تھا اور اس احساس نے میرے خیالات میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔"

علامہ اقبال پر وحید میاں کے دو مضمون (۱) انسان اقبال کی نظر میں اور (۲) اقبال اور نظریہ سعی و عمل ان کے مجموعہ مضامین "گرد راہ" میں شامل ہیں۔

خواجہ حسن نظامی سے بڑی بے تکلفی تھی۔ بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں ہونے کی وجہ سے خواجہ صاحب انہیں ماموں کہا کرتے تھے اور ان کے مضامین منادی میں شائع ہوتے تھے۔ خواجہ حسن نظامی سے خاکسار کا تعارف وحید میاں ہی کے ذریعہ ہوا تھا۔

مولانا محمد علی جوہر کے تو وہ سپاہیوں میں تھے اور ان سے نہایت عقیدت رکھتے تھے۔

قاضی عبدالغفار لکھتے ہیں۔

سیاسی سرگرمیوں کا زمانہ تھا۔ علی برادران کے ہاتھ میں جھنڈا تھا اور پرجوش اور سرفروش نوجوانوں کا ایک جتھا ان کے گرد و پیش تھا اس جتھے میں وحید احمد صاحب تھے۔ علاوہ محمد علی کے میرے اور ان کے درمیان ایک بڑا رابطہ ان کا ادبی ذوق تھا اور میرے اور ان دونوں کے ادبی ذوق کے پیر مغاں

۱؎ انوار اقبال ایضاً صفحہ ۱۷۶

مرحوم ومغفور سید محفوظ علی تھے ۔ ۔ ۔ سید محفوظ علی کی صحبت میں اس زمانہ کے نوجوان اور ناک نقشہ سے درست وحید احمد صاحب سے ملاقات ہوئی پھر جب انہوں نے مرحوم (سید محفوظ علی) کے اشارے سے رسالہ **نقیب** نکالا تو اس کے صفحات پر کچھ مضامین مَیں نے بھی لکھے ۔ (دیباچہ گرد راہ)

پانچ سال کی اسارت کے بعد جب ۱۹۱۹ء میں علی برادران کی رہائی ہوئی تو وحید میاں نے **نقیب** کا ایک خاص نمبر (جنوری ۱۹۲۰ء) نکالا جو نہایت اہم ہے اس میں وحید میاں کے علاوہ قاضی عبدالغفار، میر محفوظ علی بدایونی، سلطان حیدر جوش وغیرہ کے مضامین شامل ہیں ۔ اسی خاص نمبر کے لیے علامہ اقبال نے "شہباز و شاہین" کے عنوان سے مندرجہ ذیل شعر لکھے تھے ۔

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند — قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند
مشک اذفر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے — مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر — کم ہیں وہ طائر جو ہیں دام و قفس سے بہرہ مند

شہپر زاغ و زغن از بند قید صید نیست
این سعادت قسمت شہباز و شاہین کردہ اند

مولانا محمد علی جوہر نے عازم یورپ ہوتے ہوئے "بحالت سفر ریل" مندرجہ ذیل خط لکھا ہے اور غالباً پیغام خاص سے نوازا ہے [1]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نبی کے گھر کا غلام ہو کر قدم بڑھانے میں کیا تامل
یہ راہ وہ راہ حق ہے غافل حسین نے جسمیں سر دیا ہے

محمد علی جوہر عازم یورپ
بحالت سفر ریل ۲۰ جنوری ۱۹۲۰ء

[1] نقیب جنوری ۱۹۲۰ء

نقیب کے اس خاص نمبر کے سلسلہ میں وحید میاں لکھتے ہیں [1]

"شوکت علی محمد علی کی رہائی کی تقریب مسرت میں **نقیب** نے یہ اہتمام کیا کہ اس کے آخری نمبر کے تمام صفحات انہیں دو بھائیوں کے لیے وقف ہوں ۔ اس بات کا اعتراف ہے کہ جس قدر دلچسپ اس نمبر کو بنانا چاہیئے تھا اس قدر دلچسپ نہ بن سکا ۔ عذر کی گنجائش نہیں ہے لیکن یہ گزارش شاید کسی قدر قابل پذیرائی ہو کہ خاکسار ایڈیٹر ۲۸ جنوری تک تقریباً ان حضرات کے ہمراہ رہا ۔ باوجودیکہ اس نمبر کو شوکت علی محمد علی کے لیے وقف کرنا پیش نظر تھا پھر بھی اس عرصہ میں **نقیب** کے لیے کچھ سامان نہ کر سکا ۔ ۲۸ جنوری کے بعد سے اس خیال کو عملی جامہ پہنایا گیا ۔"

وحید میاں نے ۲۸ دسمبر ۱۹۱۹ء تا ۲۸ جنوری ۱۹۲۰ء کا "روزنامچہ علی برادران" مرتب کر کے شائع کیا ہے جو خاصہ کی چیز ہے ۔

غرض **نقیب** کے ذریعہ وحید میاں نے خاصا کام کیا اور نام پایا ۔ ان کے ہمعصر رسائل و جرائد نے صرف "**نقیب**" کو سراہا بلکہ وقتاً فوقتاً اس پر گرانقدر رائے کا اظہار کیا ہے چنانچہ صبح امید" لکھنؤ، جنوری ۱۹۲۱ء کے شمارہ میں "**نقیب**" بدایوں پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہے [2]

" **نقیب** " (اکتوبر نومبر دسمبر ۱۹۲۰ء) نقیب کے اکتوبر نومبر ایک ساتھ اور دسمبر نمبر علیحدہ تینوں ایک ہی ماہ کے اندر شائع ہوتے ہیں ۔ ان تینوں پرچوں میں کئی مضامین قابل قدر ہیں "یہ روغن قاز" از محمد عظمت اللہ خاں صاحب اور "عالم ارواح" از سلطان حیدر جوش

[1] نقیب جنوری ۱۹۲۰ء [2] جرنل خدا بخش لائبریری پٹنہ نمبر ۱-۱۱ (۱۹۷۹ء)

دونوں مضامین دل چسپ ہیں اور اپنے رنگ میں اچھے ہیں۔۔۔" ہندوؤں کے مختلف مذاہب" عزیز آسیونی نے ایک مفصل اور دل چسپ مضمون لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب مضمون نے ہنود کے مذاہب و فلسفہ سے واقف ہونے کی کوشش کی ہے جو اس امر کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ اہل اسلام بالعموم اس طرف سے لاپروا ہوتے ہیں، قابل تحسین ہے۔ محمد مبین صاحب نازش بدایونی نے حکیم مرزا آغا حسن ازل لکھنوی کا کلام اور بالخصوص ان کی مثنوی سحر عشق پر تبصرہ کیا ہے جو خوب ہے۔۔۔ انہی نمبروں میں حضرت اکبرالہ آبادی کا کچھ تازہ کلام بھی شائع ہُوا ہے۔ ملک کی موجودہ صورت حال کو حضرت اکبر نے اپنے مخصوص رنگ میں چند اشعار میں خوب بیان کیا ہے **نقیب** کے دسمبر نمبر میں صرف ایک مضمون اچھا ہے حامد اللہ صاحب افسر نے "عہد مغلیہ میں ہندوستان میں ترویج تعلیم" کے عنوان سے ایک بسیط مضمون لکھا ہے اس امر کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ صاحب مضمون صرف ایف اے کلاس کا طالب علم ہیں، مضمون قابلِ داد ہے۔"

وحید میاں، حضرت بابا فریدالدین گنج شکر کی اولاد امجاد سے تھے، شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ ان کے بزرگوں میں تھے وہ تصوف کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے اور اس سلسلہ میں انہوں نے خاصا ریاض کیا مختلف مشائخ، صوفیہ اور فقرا سے ملے ان سے گفتگو اور صحبتیں رہیں بعض مجاہدے اور ریاضتیں بھی کیں بدایوں میں شاہ ولایت صاحب کی درگاہ شہر سے دور جنگل میں ہے۔ رات میں وہاں کسی کا گزر نہیں ہوتا۔ وحید میاں راتوں میں شاہ ولایت صاحب کی درگاہ میں بھی رہے۔ مولانا یعقوب بخش راغب بدایونی (ف ۱۹۴۸ء) اس ذوق و جستجو میں ان کے شریک سفر رہے۔ بعض اوقات وحید میاں نے ان واقعات کی تفصیل بھی بیان کی جو اب ذہن میں نہیں رہی۔

وحید میاں کا اخلاق اعلیٰ، طرز گفتگو ملائم اور مزاج میں سادگی تھی۔ چھوٹوں بڑوں سب سے محبت سے پیش آتے۔ عجز و انکسار طبیعت میں بدرجہ اتم تھا۔ برصغیر کے نامور اصحاب رشد و ہدایت سے عقیدت رکھتے تھے مولوی محمد امیر گیلانی (ریکہ توت، پشاور) حکیم اہل سُنّت حکیم محمد مُوسیٰ امرتسری (لاہور) اور شاہ عزیز میاں نیازی (بریلی) وغیرہ سے ان کے روابط تھے۔ تصوف اور تاریخ تصوف کا اعلیٰ ذوق رکھنے کی بنا پر انہوں نے حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ، بابا فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ اور مخدوم صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ، اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکّی رحمۃ اللہ علیہ اور تصوف پر مختلف کتابیں اور مضامین لکھے۔

وحید میاں خیرآباد کے دور آخر کے قلندریہ سلسلہ کے مشہور بزرگ شاہ مقبول انور قلندر (ف ۶ ذی الحجہ ۱۳۷۹ھ) سے بیعت تھے۔ صابری سلسلہ سے وہ نہایت عقیدت و محبت رکھتے تھے اور آخر میں اپنے نام کے ساتھ "صابری" بھی لکھنے لگے تھے اور اس سلسلہ میں انہوں نے ایک نہایت دلچسپ خط خط حکیم محمد مُوسیٰ امرتسری صاحب کو لکھا تھا۔ ۱۹۲۸ء سے خاص طور سے ان کی توجہ تصوف اور روحانیت کی طرف مائل ہوئی۔ ۱۹۱۷ء اور ۱۹۲۸ء میں حضرت گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے عرس میں شریک ہوئے اور دیوان سید محمد سجادہ نشین پاک پٹن (ف ۱۳۵۳ھ/۱۹۳۴ء) نے ان سے خاص تعلق اور محبت و شفقت کا اظہار کیا۔[1]

یہ پیلی بھیت سے بدایوں آتے ہوئے ٹرین کے حادثہ میں ان کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی جس کی وجہ سے چلنے پھرنے سے معذور ہوگئے تھے اور اسی حالت میں ۱۱ جنوری ۱۹۷۷ء کو وحید میاں کا انتقال ہُوا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ ط

حکیم محمد مُوسیٰ امرتسری صاحب نے آخری دور کی علالت اور انتقال کی کیفیت اپنے نام ان کی صاحبزادی قریشہ بیگم کے ایک خط کی روشنی میں اس طرح لکھی ہے[2]

---

[1] سوانح حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکر از وحید احمد مسعود (رضا پبلی کیشنز لاہور ۱۹۸۱ء) ص ۶۴ و ص ۲۶۰ (۲ نوٹ اگلے پر دیکھیے)

۵؍جنوری کو طبیعت خراب ہوئی۔ ڈاکٹر کو دکھایا گیا۔ اس نے کہا کہ سردی کا اثر ہے۔ ۶؍تاریخ کو آیت الکرسی کا ورد رہا کہ ایک منٹ کو زبان نہ رکی۔ ۷؍کو آیت کریمہ اس طرح پڑھی کہ ایک منٹ کو زبان نہ رُکی۔ ۸؍کو یا اللہ، یا رحمٰن، یا رحیم مسلسل پڑھتے رہے۔ ۹؍کو سکوت کا عالم رہا۔ ۱۰؍کو سیدھی جانب دیکھ کر کہتے یا خواجہ! الٹی جانب دیکھ کر کہتے یا بابا! اور آسمان کی طرف دیکھ کر کہتے یا اللہ۔ شام کو کہا کہ اگر میرے بعد کوئی میری اولاد میں سے روئے گا تو میری رُوح کو تکلیف ہوگی، رات کو سات بجے کہا کہ آج ہمیں کسی کی ضرورت نہیں ہے کھاؤ، پیو، خُوش رہو اور خُود شوربا پیا اور پانی خوب پیا۔ وضو کیا اور نماز پڑھی اور سو گئے مگر میرا بھائی وہیں رہا۔ ۱۲؍بجے رات اُٹھے اور تین مرتبہ پے در پے وضو کیا اور لیٹ گئے اور میرے بھائی سے کہا کہ کمرے کا دروازہ کھول دو، اس نے کھول دیا۔ پانچ آدمی کمرے کے اندر آ گئے دو کو نہایت احترام سے اپنی سیدھی طرف بیٹھنے کو کہا اور تین کو اپنی الٹی جانب بیٹھنے کو کہا۔ پھر سامنے دیکھ کر اپنے چہرے کو بالکل سامنے ہاتھ ملا کر کہا ابھی آتے ہیں ابھی آتے ہیں اور با آواز بلند تین بار یا اللہ، یا رحمٰن، یا رحیم پڑھا۔ پھر خوب آواز سے کلمہ پڑھا اور تین سانسیں لیں اور خالقِ حقیقی سے جا ملے"۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

وحید میاں تصنیف و تالیف کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے تاریخ اور تصوف سے ال
کو خاص لگاؤ تھا تحقیق کی طرف طبیعت کا خاص رجحان تھا۔ مگر انداز تحریر نہایت پختہ اور ادیبانہ ہے۔ بعض
مضامین تو بلا شبہ "انشائیہ" کا نمونہ ہیں۔ کبھی شعر بھی کہتے تھے غالباً یہ حیرانی کی بات ہوگی نمونہ ملاحظہ ہو

خلاقِ عالم مختار و توانا ہے — تو آپ ہی سب کچھ ہے اور مثل سے بالا ہے

(نوٹ گذشتہ سے پیوستہ) ۲؎ سوانح حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر (تعارف مصنف) از وحید احمد مسعود ناشر رضا پبلی کیشنز - لاہور -

اضداد میں ممکن ہے اثبات میں کامل ہے — ہر شے کی حقیقت ہے ہر شے سے مبرّا ہے
مشہود تو ہوتا ہے محسوس نہیں ہوتا — مستور ہے جلوت میں خلوت میں ہویدا ہے
مَیں بندۂ عاجز ہوں اور عجز پہ نازاں ہوں — کر تُو جو تری مرضی ہو، مرضی تری اولیٰ ہے
یہ جد و جہد میری تسکین ہی تسکیں ہے — ہوتا ہے وہی آخر جو کچھ ترا منشا ہے

اس نام کی خاطر سے احمد پہ کرم کرنا
ناکارہ و بے بس ہے لیکن ترا بندہ ہے

اب ہم وحید میاں کے تصنیفی و تالیفی کام کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔

تصوّف

تصوف کے موضوع پر ایک مختصر رسالہ ہے۔ پروفیسر ضیا احمد بدایونی مرحوم نے رسالہ "الناظر"، لکھنؤ میں تصوف پر ایک مضمون لکھا تھا۔ اس سے متاثر ہو کر وحید میاں نے یہ رسالہ لکھا۔ اس کی اساس و بنیاد امام شعرانی کے رشحات قلم ہیں۔

تصوّف کی اصلیّت

۴۸-۱۹۴۷ء میں مسلمانانِ ہند ایک عجیب دور ابتلا سے گزر رہے تھے اس زمانہ میں انہوں نے یہ رسالہ لکھا اور بتایا کہ انتشار و ابتلا کے دَور میں صوفیہ نے کیسی شاندار خدمات انجام دی ہیں اور انہوں نے ہر حال میں شرع کا ادب کیا اور تصوف، کتاب و سُنّت سے مستحکم اور اخلاق انبیاء و اصفیا کے سلوک پر مبنی ہے اور احکام شریعت پر عمل کرنے کی ہر حال میں پابندی ہے۔ تصوف کے بعض دوسرے نکات و مسائل پر بھی نہایت سلجھے ہوئے انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔ رسالہ مختصر ہونے کے باوجود جامع ہے اپریل ۱۹۴۹ء میں نولکشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوا ہے۔

سوانح بابا فرید الدّین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ

انہوں نے اس کتاب میں عقیدت و روایت سے ہٹ کر تاریخ و تحقیق کی روشنی میں بابا صاحب

رحمۃ اللہ علیہ کے حالات پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ اس کر
کا مسودہ بھی اشاعت کی غرض سے خاکسار کو ارسال فرمایا میرے چھوٹے بھائی مرحوم محمد نعمت اللہ قادری (ف
۱۹۸۱ء) نے اہتمام کے ساتھ پاک اکیڈمی کراچی کی طرف سے شائع کیا اور علمی حلقوں میں کتاب مقبول ہو
اس کا دوسرا ایڈیشن راقم الحروف کی تحریک پر رضا پبلی کیشنز لاہور نے شائع کیا ہے محترمی حکیم محمد موسیٰ امرتسر
صاحب نے تعارف لکھا ہے۔

جمالِ صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ

مخدوم صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ کے احوال و آثار کے بارے میں ہم عصر تاز
تقریباً خاموش ہیں۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے ا
کی شخصیت کو متعین و مقبول بنایا ہے لطف کی بات یہ ہے کہ خود ان کے ملفوظات و مکتوبات میں مخدوم صابر
رحمۃ اللہ علیہ کا کوئی حال یا ذکر تک نہیں ہے وحید میاں کو اس سلسلہ سے خاص دلچسپی اور وابستگی تھی انہوں نے
اس رسالہ میں ان کے حالات کی ترتیب و تدوین کی کوشش کی ہے۔ یہ مختصر سا رسالہ نظامی پریس
بدایوں سے ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا ہے۔

صابری سلسلہ

اس موضوع پر یہ رسالہ مفید اور معلوماتی ہے ۱۹۷۱ء میں نظامی پریس بدایوں سے
شائع ہوا ہے۔ وحید میاں نے ایک تنقیدی مضمون بعنوان "پیر کلیر کے تذکر
بھی لکھا تھا جو ہم نے رسالہ "بصائر" کراچی (جلد ۶ شمارہ ۱-۲) میں شائع کیا تھا۔

صابری تعلیمات

اپنے موضوع پر مکمل و مدلل کتاب ہے مگر طبع نہ ہو سکی۔

پٹاری

نواب فرید (ف ۱۶۶۶ء) نے ۱۶۲۵ء تا ۱۶۲۸ء میں شیخوپور کی تعمیر کی بہت سی عمارت
اور محل سرائیں بنوائیں اور خود پاک پٹن جاکر بابا فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب
تبرکات لاتے اور انہیں اپنی خواب گاہ کے بالاخانے پر محفوظ کیا۔ چونکہ وہ تبرکات پٹاری میں رکھے جا
تھے لہٰذا اسی نام سے موسوم ہو گئے اور حضرت گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے یوم وفات ۵ محرم کو ہر سال

شیخوپور میں ان تبرکات کی زیارت کرائی جاتی ہے شاید یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہو کہ نواب مراد کے بیٹے رحیم الدین نے
نواب علی محمد خاں (ف ۱۱۶۲ھ / ۱۷۴۹ء) کے پسر چہارم نواب محمد یار خاں امیر (ف ۱۱۸۸ھ) سے جو شعر و تصوف کا ذوق
رکھتے تھے، راہ و رسم پیدا کی اور شیخوپور کی پٹاری کے کچھ تبرکات نواب محمد یار خاں کو پیش کر دیئے جب اہل
خاندان کو اس کارروائی کا علم ہوا تو نوبت کشت و خون تک پہنچی۔

وحید میاں نے "پٹاری" کے عنوان سے ان تبرکات کی تفصیل قلم بند کی ہے یہ رسالہ ۱۹۵۴ء میں
نظامی پریس بدایوں میں طبع ہوا ہے۔

سواء السبیل

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی نے نظریۂ وحدت الوجود کے مقابلہ
میں نظریہ وحدت الشہود پیش کیا۔ وحید میاں نے اس رسالہ میں ہر دو نظریات
کو بیان کرتے ہوئے اوّل الذکر کی تائید کی ہے اس موضوع پر شاہ ولی اللہ دہلوی اور حاجی امداد اللہ مہاجر
مکیؒ وغیرہ نے بھی رسائل لکھے ہیں۔ یہ تمام مواد ان کے سامنے رہا ہے یہ رسالہ غیر مطبوعہ ہے۔

اسلام مشرق میں

اس کتاب میں وسط ایشیا کے علاقوں اور قوموں میں اسلام کی تبلیغ ،
پس منظر، تاریخ اور اسلام پھیلانے والوں کی کاوشوں اور کوششوں کو
بیان کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اسلام میں اپنے طور پر پھیلنے کی پوری صلاحیت موجود ہے اور اہل مشرق
کی روحانیت پسند طبیعتوں کا بھی اسلام کو قبول کرنے میں خاصا دخل رہا ہے اس کتاب میں مغلوں کے اسلام
لانے کا مختصر مگر جامع ذکر ملتا ہے۔ اس کتاب کے مآخذ زیادہ تر انگریزی اور کم تر فارسی ہیں اس موضوع پر اردو
زبان میں یہ اولیں کتاب ہے۔ فاضل مؤلف نے اس کتاب کے لیے مواد اس وقت مہیا فرمایا تھا جب
وہ یو۔پی گورنمنٹ میں پارلیمنٹری سیکرٹری تھے جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں [1]

" میں یو۔پی گورنمنٹ میں پارلیمنٹری سیکرٹری تھا۔ اسی زمانہ میں میں نے
مغلوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا تھا اور متفرق نوٹ جمع کئے تھے۔ چنانچہ فہرست

میں ان سب کتابوں پر نمبر ڈال دیئے ہیں اور اس کتاب کے متن میں ہر اقتباس پر ماخذ کے نمبر کا حوالہ دے دیا گیا ہے تاکہ واقعات کی سند کا پتہ چل سکے ۱۹۵۲ء میں جب میں اس عہدے سے سبکدوش ہوا تو جمع شدہ نوٹوں کو مرتب و منسلک کرنے کا خیال آیا"۔ (ص۲)

منصوری کوہ منصوری کی سیر کے حالات دل چسپ اور ظریفانہ انداز میں لکھے گئے ہیں پہلے یہ مضمون رسالہ نقیب میں شائع ہوا اور بعد ازاں کتابچہ کی صورت میں ستمبر ۱۹۲۰ء میں نقیب پریس بدایوں میں چھپا اور اشاعت پذیر ہوا۔

محبت کی بلندیاں اسلامی تاریخ کے ایک واقعہ کو ڈرامہ کی شکل میں پیش کیا ہے یہ ڈرامہ ۱۹۵۹ء میں نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوا ہے۔

نشہ کا اتارنا ہمارا خیال ہے کہ جب ۳۹-۱۹۳۷ء میں یو۔ پی میں کانگریسی وزارت وجود میں آئی۔ اس زمانہ میں یہ ڈرامہ لکھا گیا تھا۔ پہلے ہاشمی پریس بدایوں میں طبع ہوا پھر یو۔ پی گورنمنٹ نے شائع کیا۔

آنریری مجسٹریٹ ان کے خاندان اور شہر بدایوں میں متعدد آنریری مجسٹریٹ تھے، خیال ہے کہ ان کو سامنے رکھتے ہوئے ظرافت کے پیرایہ میں اظہار خیال کیا ہے۔

عقل و عقیدہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کی تشریح و تنقید پر مشتمل ہے۔ کتاب غیر مطبوعہ ہے۔

دھوپ چھاؤں سیاسی ادبی اور ظریفانہ مضامین کا غیر مطبوعہ مجموعہ ہے۔

انتخاب رسالہ نقیب میر محفوظ علی بدایونی کے مضامین کا انتخاب جسے الناظر بک ایجنسی لکھنؤ نے شائع کیا۔

گردِ راہ ادبی اور سیاسی مضامین کا مجموعہ ہے جس زمانہ میں وہ پارلیمنٹری سیکرٹری تھے اس وقت یہ کتاب مرتب و شائع ہوئی چنانچہ ان کے صاحبزادے فرید احمد مرحوم لکھتے ہیں۔

"یہ فیصلہ کیا گیا کہ جناب والد صاحب قبلہ کے صرف وہ مضامین ایک جگہ جمع ہو جائیں جو حالیہ ہیں اور قریب قریب لکھنؤ میں لکھے گئے ہیں۔ یہ سب مضامین فائلوں کے انبار سے آنکھیں چرا کر اور ملاقات کرنے والے اصحاب سے دامن بچا کر جو لمحے میسر آسکے ان میں قلم بند کئے گئے ہیں اور سب کے سب گویا گردن دبا کر لکھوائے گئے ہیں یعنی احباب کے اصرار سے مجبور ہو کر وقتاً فوقتاً لکھے گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ ان سے موجودہ زمانے کی روش اور تخیل کا ڈھنگ معلوم ہو سکے اور کچھ نہیں تو ان مضامین سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ فرائض منصبی کی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود ادب کے حسین اور سکون بخش چشمے پر اس کے تشنہ لب پہنچ ہی جاتے ہیں۔ (پیش لفظ)

گردِ راہ میں مندرجہ ذیل مضامین شامل ہیں۔

(۱) انسان اقبال کی نظر میں (۲) غزل (۳) اقبال اور نظریۂ سعی و عمل (۴) میل ملاپ (۵) ممبروں کے حقوق (۶) بندر کا ناچ (۷) طلوع آزادی۔ (۸) بدایوں میں آزادی کے دن (۹) اکبر کے لطیفے (۱۰) فتح مبین (۱۱) عید کے موقع پر گائے کی قربانی ضروری نہیں (۱۲) مُسلمان کیا کریں؟ (۱۳) دیوالی کا پیغام (۱۴) گرونانک صاحب کا فلسفہ (۱۵) ایک صلاح۔

اس کتاب پر تعارف قاضی عبدالغفار نے لکھا ہے اور یہ کتاب رفیع احمد قدوائی کے نام معنون کی گئی ہے اس کا پہلا اڈیشن ۱۹۴۸ء میں نامی پریس لکھنؤ سے چھپا اور جلد ہی دوسرا اڈیشن

بھی شائع ہوا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس کتاب کے ذریعہ مسلمانوں کی ذہنی جلا اور آزاد ہندوستان کے ماحول سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

عروج شیخوپور

شیخوپور کے فریدی شیوخ کے اخبار و حالات میں اس خاندان کے مختلف بزرگوں نے لکھا ہے۔ بانی شیخوپور نواب فرید کے حالات مشہور ادیب سلطان حیدر جوش (ف ۱۹۵۴ء) نے "نواب فرید" کے نام سے لکھے ہیں یہ کتاب ۱۹۱۷ء میں نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوئی ہے۔

وحید میاں کے پردادا شیخ فتح الدین ولد شیخ شمس الدین نے خاندانی حالات پر مشتمل فارسی زبان میں ایک رسالہ ۱۲۶۹ھ میں لکھا جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں۔

"فقیر حقیر فتح الدین بن شمس الدین فریدی فاروقی شیخوپوری کہ این چند ورقیست دربیان حال حسب ونسب خود از شیخ شمس الدین تا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہٗ و تا حضرت آدم علیہ السلام و چند حالات و بیان دیگر متعلق این از کتاب جواہر فریدی تصنیف شیخ علی اصغر و کتاب انور الثقلین تصنیف نواب کشور خاں و دیگر بزبانی بزرگان خود و دیگر ثقات شیخوپور و بدایوں وغیرہ آنچہ کہ درسمع رسیدہ بود در ۱۲۶۹ ہجری النبوی صلی اللہ علیہ وسلم مطابق ۱۲۶۰ فصلی و ۱۸۵۳ عیسوی برائے یادگار خود و دریافت برخورداران اقبال نشاناں شیخ شرف الدین و ذوالفقار الدین و مستجاب الدین بقید قلم آوردم۔"

اس رسالہ میں بقول وحید میاں، ستھرے میاں نے اضافہ کیا لیکن یہ حالات مختصر و مبہم لکھے گئے ہیں پھر اس میں مزید اضافے حکیم احمد جان مرحوم نے کئے جس کی ایک بوسیدہ نقل قادری میاں کے پاس بتائی جاتی ہے۔

وحید میاں نے شیخ فتح الدین کے رسالہ کی اساس و بنیاد پر اردو میں ایک کتاب مرتب کر دی ان کی نظر سے ستھرے میاں اور حکیم احمد جان مرحوم کے بھی مخطوطے گزرے ہیں۔ وحید میاں نے اس کتاب میں شجرے اپنے زمانہ تک مکمل کر دیئے۔ اس میں کہیں کہیں تنقید و تبصرہ بھی کیا ہے۔

راقم الحروف محمد ایوب قادری جب اگست ۱۹۷۰ء میں بدایوں گیا تو وحید میاں نے شیخ فتح الدین کا مؤلفہ رسالہ (تذکرہ خاندانِ شیوخ شیخوپور) مع اپنے مسودہ کے مجھے مرحمت فرمایا۔ خاکسار نے ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء میں اس مسودہ کو صاف اور مرتب کیا اور جب غور کیا تو "عروج شیخوپور" سے ۱۴۰۳ھ برآمد ہوئے چونکہ اس مسودہ پر کوئی نام نہیں تھا لہٰذا میں نے اس کا نام "عروج شیخوپور" رکھ دیا ہے۔ وحید میاں کے ہاتھ کا تحریر کردہ مسودہ میں نے اپنے دوست جمال الدین مونس نظامی (ایڈیٹر ذوالقرنین، نظامی پریس بدایوں) کو دے دیا جنہیں بزرگوں کے آثار جمع کرنے کا شوق ہے۔ "عروج شیخوپور" کی عکسی نقول سید شہید حسین بدایونی، مونس نظامی اور کفیل الدین فریدی نے مجھ سے لیں۔

سیّد احمد شہیدؒ کی صحیح تصویر

سیّد احمد شہیدؒ بریلوی کی تحریک پر جعفر تھانیسری، ابوالحسن علی ندوی اور غلام رسول مہر نے کام کیا ہے۔ سب سے زیادہ ضخیم کام مہر مرحوم کا ہے انہوں نے سید صاحب کے خطوط اور ہم عصر مفصل کتاب منظورۃ السعداء سے خوب کام لیا ہے ان بزرگوں نے عقیدت و ارادت کے قلم سے حسین تصویر کشی کی ہے۔ ضرورت تھی کہ سیاسی و تاریخی پس منظر میں اس تحریک کا مطالعہ و تجزیہ کیا جاتا۔ وحید میاں نے اسی نقطہ نظر سے یہ کتاب لکھنے کی کوشش کی ہے اور بعض اہم سوالات و نکات اٹھائے ہیں اور دعوت غور و فکر دی ہے اگرچہ ان کے اخذ کردہ ہر نتیجہ سے اتفاق رائے ضروری نہیں۔

یہ کتاب سب سے پہلے "منادی" دہلی کے ایک خاص نمبر (ستمبر ۱۹۶۵ء) میں شائع ہوئی اور اس رسالہ کے مدیر خواجہ حسن ثانی صاحب نے دعوت دی کہ اس مبحث پر جو صاحب بھی اور خاص طور سے غلام رسول مہر صاحب لکھیں گے تو "منادی" میں ضرور شائع کیا جائے گا چنانچہ لوگوں نے مہر صاحب سے تقاضا کیا کہ وہ جواب لکھیں انہوں نے عذر کیا کہ "منادی" کا مذکورہ شمارہ ان کے سامنے نہیں ہے۔ راقم الحروف نے "منادی" کے اس خاص شمارہ کا ذاتی نسخہ مہر صاحب کو پیش کیا بعد ازاں یہ خاص شمارہ اگست ۱۹۶۶ء میں لاہور سے کتابی شکل میں بھی شائع ہو گیا۔ راقم الحروف چاہتا تھا کہ مہر صاحب اس کتاب پر اظہار خیال فرمائیں مگر وہ طرح دے گئے اور اپنے ایک مکتوب مورخہ ۲۲ نومبر ۱۹۶۷ء میں ارقام فرمایا۔

"باقی رہا سید احمد شہید کا معاملہ تو بھائی صاحب اس عاجز نے اپنی زندگی کے بیشتر سال اس تحریک کی چھان بین میں گزارے، بے خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ "سید احمد شہید" کے متعلق اتنی کتابیں شاید کسی نے دیکھی ہوں، جتنی میں نے دیکھیں۔ سید شہید کے مقامات جہاد اس تفصیل سے غالباً آج تک کوئی نہ دیکھ سکا لیکن .... والوں کا طریقہ یہ ہے کہ کچھ وقت گزر جاتا ہے تو چند الٹی سیدھی باتیں لکھ کر ایک رسالہ چھاپ دیتے ہیں۔ اس نوع کی لغویات میں کون وقت صرف کرے .... میں پچھلے دنوں بیمار ہو گیا نزلی بخار نے خاص تنگ کیا ابھی تک صحت کاملہ نصیب نہیں ہوئی۔ بلغم کی تولید اور ایک حد تک انجماد کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ ذرا طبیعت صاف ہو جائے تو ان شاء اللہ اس پر بھی لکھنا ہے جس میں از سر نو مسئلہ کے بنیادی حقائق واضح ہو جائیں گے۔ بالفعل انتخابات کے جھگڑوں میں سب لوگ مصروف ہیں۔ ان ہنگاموں میں نہ لکھے مضامین چھپنے کا کسی کو ہوش ہے اور نہ پڑھنے کا۔"

اس کے بعد جب مہر صاحب کی مندرجہ ذیل تحریر نظر سے گزری تو اطمینان ہو گیا کہ اس باب میں وہ کچھ نہ لکھیں گے۔[1]

"سرسید مرحوم نے مصلحتہً غلط باتیں کہی تھیں اور آپ جانتے ہیں کہ وہ "دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز" کے قائل تھے۔ میں مجاہدین کی شان و آبرو بہر حال قائم رکھنے کا قائل ہوں اگرچہ وہ سابقہ بیانات یا توجیہات سے عین مطابق نہ ہو"

راقم الحروف کی درخواست پر وحید میاں نے اپنے حالات بھی لکھے تھے مگر کچھ دنوں کے بعد انہوں نے اطلاع دی کہ "میں نے وہ کتاب ضائع کر دی" خدا کرے اس کا کوئی مسودہ وغیرہ کہیں "محفوظ" ہو تو وہ ایک علمی ادبی اور تاریخی شاہکار ہوگا۔ وحید میاں کی مراسلت سیاسی، علمی اور ادبی حضرات سے ہوتی تھی۔ اس کی بھی ضرورت ہے کہ ان کے خطوط جمع کئے جائیں۔

آخر میں ہم ان کی کتاب "سوانح خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ" پر اظہار خیال کرتے ہیں۔

سوانح خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ

برصغیر میں سب سے پہلے مسلمانوں کے قدم سندھ و مکران میں پہنچے اور محمد بن قاسم نے اس علاقہ میں اسلام روشناس کرایا۔ دوسرا دور غزنویوں کے عہد اقتدار سے شروع ہوا۔ دولت غزنویہ میں موجودہ پاکستان کا کم و بیش تمام علاقہ شامل تھا۔ سیاسی اقتدار اور علماء و مشائخ کے قیام اور کوششوں کی بدولت جلد ہی یہاں اسلامی معاشرہ کو تقویت حاصل ہوئی۔ جگہ جگہ صدہا مساجد اور مدارس قائم ہوئے۔ عربی فارسی کی نشر و اشاعت ہوئی اور لاہور ایک اسلامی شہر بن گیا۔ عوفی نے اپنے تذکرہ لباب الالباب میں ایک باب "فضلائے غزنین و لاہور" پر لکھا ہے۔ ان شعراء میں ابوالفرج رونی (ف تقریباً ۵۰۸ھ) مسعود سعد سلمان (ف ۵۱۵ھ) مشہور شاعر ہیں ان دونوں کے دیوان زیور طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔

اس زمانہ میں لاہور میں شیخ حسین زنجانی، حضرت داتا گنج بخش اور شیخ اسماعیل محدث

[1] افادات مہر مرتبہ ڈاکٹر شیر بہادر خاں پنی (لاہور ۱۹۷۴ء) ص ۲۳۱-۲۳۲

جیسے صوفیہ، وعلما مقیم ہیں اور وہ تبلیغ و تذکیر کے فرائض انجام دے کر ان علاقوں میں اسلام کو سربلند کر رہے تھے ان ہی بزرگوں کی کوششوں سے برصغیر کی مختلف قومیں اور قبیلے مشرف باسلام ہوئے اور بہت سے خاندان اور صاحب حیثیت افراد مختلف دیار و امصار سے لاہور میں سکونت پذیر ہوئے اور انہوں نے اسلامی معاشرہ کو تقویت دی۔

جیسا کہ یمین خاں لاہوری لکھتے ہیں[۱]

این سلسلہ ورود دانشمنداں از افغانستان و ترکستان و ایران بہ پایۂ تخت لاہور غزنویاں از عصر مسعود اوّل) بن محمود غزنوی تا آخر عصر ابراہیم غزنوی یعنی از سال ۴۲۱ھ تا ۴۹۲ھ تقریباً ہفتاد سال ادامہ داشت تا آنکہ یک جمع غفیر از دانشمندان و سخنورانِ فارسی گویاں در لاہور مستقلاً سکنیٰ گزیدند۔"

سید ہاشمی فرید آبادی پورے غزنوی دور پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں[۲]

" نئے پایۂ تخت لاہور میں ہم کئی اوّل درجہ کے صاحبانِ علم و فضل اور معیاری شعرا کے نام سنتے ہیں جو دربار خسرو ملک کے متوسل تھے ... بہر حال لاہور ہی سے امام صغانی جیسے بزرگ استاد حدیث اور آداب الحرب والشجاعہ کا مشہور مصنف فخر مدبر مبارک شاہ منسوب کئے جائیں گے۔

علماء اور صدور میں چند نام ان کی شعر گوئی کی بدولت سلامت رہ گئے جیسے (۱) افصح العجم اعجوبۃ الزمان "سراج الدین منہاج" (۲) ثقۃ الدین جمال الفلاسفہ یوسف ابن محمد دربندی (۳) شہاب الدین محمد ابن رشید محتاج (۴) یوسف ابن

۱؎ تاریخ شعر و سخنوران فارسی در لاہور از یمین خاں لاہوری (نیشنل بک ہاؤس کراچی ۱۹۷۱ء)

۲؎ مآثر لاہور از سید ہاشمی فرید آبادی (ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۵۶ء) صفحہ ۱۳۵

نصر کاتب اور (۵) ضیاء الدین عبدالرافع طبیب، ایک باکمال انشا پرداز اور شاعر جسے خسرو ملک نے قید اور آخر میں قتل کرا دیا (۶) نصراللہ فرقدی تھا۔ ناصر دربار کے شعرا میں علی ابن عمر اور ابوبکر خسروی کا تذکرہ ملتا ہے۔"

غوری حکومت کے قیام کے ساتھ ساتھ برصغیر میں چشتیوں کا داخلہ ہوا اور ان کے قائد و رہنما اور اس سلسلہ کے بانی حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری ہیں۔ انہوں نے دیار ہند میں شجر اسلام کو بار آور کیا۔ ان کی قربانیاں اس اعتبار سے بے مثال ہیں کہ وہ رائے پتھورا کی راجدھانی کفرزار اجمیر میں بیٹھ کر اصلاح معاشرہ میں مشغول ہو گئے۔ لوگوں کو اللہ کے پیام سے روشناس کرانے لگے اور گویا يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ○ کا منظر پیش کر دیا۔ انہوں نے اپنے خلفا کو گجرات، دکن اور شمالی ہند میں پھیلا دیا اور اصلاح و تبلیغ کی تحریک برپا کر دی۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے احوال و آثار ہم عصر ماخذ اور تاریخی نوشتوں میں محفوظ نہ رہ سکے لیکن تعلیم اور اثر و نفوذ کا سلسلہ جاری و ساری رہا۔ سیر الاولیا پہلی کتاب ہے جس میں حضرت خواجہ کا ذکر تبرکاً ملتا ہے۔ فوائد الفواد اور خیر المجالس کے ذریعہ بات آگے بڑھتی ہے۔ سیر العارفین پہلا تذکرہ ہے کہ جس میں حضرت خواجہ کے حالات قدرے تفصیل سے پیش کئے ہیں اور بعد کے تذکرہ نویسوں نے اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا ہے شاید یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہو کہ سیر العارفین کے مؤلف نے سیر الاولیا، فوائد الفواد اور خیر المجالس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا ہے اور مشائخ چشت سے منسوب دیگر ملفوظات انیس الارواح دلیل العارفین، فوائد السالکین، اسرار الاولیا، راحت القلوب، افضل الفوائد، اور مفتاح العاشقین وغیرہ کا کوئی حوالہ یا ذکر نہیں کرتا۔ ہمارا خیال ہے کہ یا تو یہ ملفوظات اس وقت تک وجود ہی میں نہیں آئے تھے یا جمالی نے ان کو خود ہی مسترد کر دیا۔

ظن غالب ہے کہ یہ مواد دورِ مغلیہ میں وجود میں آیا کیونکہ اکبر اعظم نے پیادہ پا اجمیر جا کر نذ

اجمیر کی اہمیت میں اضافہ کر دیا۔ رؤسا، امراء اور شاہزادگان کی توجہ ہوئی اکبری اور شاہجہانی تعمیرات اس کا بین ثبوت ہیں بہر حال عہد سلطنت میں یہ صورت حال نہ تھی۔ تاریخ فرشتہ اور آئین اکبری وغیرہ میں بھی حضرت خواجہ کا ذکر ملتا ہے۔

اردو زبان میں حضرت خواجہ کے حالات بعض غیر معروف مصنفین نے عقیدت وارادت کے انداز میں لکھے اور غالباً عبدالباری معینی اجمیری پہلے شخص ہیں جنہوں نے تاریخ السلف (۱۹۲۵ء) لکھ کر تحقیقی کام کا آغاز کیا۔ علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر عبدالباسط ایم۔ اے لکھتے ہیں[1]

"تاریخ السلف ایسی کتاب ہے جو اردو لٹریچر میں ایک نرالی حیثیت رکھتی ہے جناب مولوی عبدالباری صاحب معینی اجمیری نے حضرت خواجہ صاحب کے حالات پر تنقید کی ہے اور انہیں تاریخ کی روشنی میں لانے کی کوشش کی۔ . . .

مصنف موصوف نے حضرت خواجہ صاحب کے حالات پر تاریخی اصول سے روشنی ڈالی ہے۔"

اس طرح کی دوسری کوشش خادم حسن زبیری نے معین الارواح (۱۹۵۳ء) لکھ کر کی وہ بھی تاریخ و تحقیق کی روشنی میں آگے بڑھتے ہیں اس کتاب کے دو ایڈیشن شائع ہوئے ایک مفصل اور ایک مختصر صغیر کی تہذیبی و ثقافتی تاریخوں میں بھی حضرت خواجہ کے حالات اور تعلیمات کا ذکر ملتا ہے اس سلسلہ میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی بزم صوفیہ، مولانا ابوالحسن علی ندوی کی تاریخ دعوت و عزیمت اور شیخ محمد اکرام کی آب کوثر قابلِ ذکر ہیں مگر تعجب ہے کہ مؤلف آبِ کوثر نے ایک شخص "معین الدین تولکی" کو حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ قرار دے دیا۔ طبقات ناصری کی واضح عبارت ملاحظہ ہو[2]

[1] علی گڑھ میگزین ۱۹۲۶ء صـ ۱۱۲

[2] طبقات ناصری از منہاج سراج (مرتبہ عبدالحی حبیبی) (کابل ۱۳۴۲ھ ش) صـ ۴۰

این داعی از ثقہ شنید کہ از معارف بلاد	اس مؤلف نے ایک معتبر آدمی سے سنا کہ جو
تولک و جبال بود لقب او معین الدین	تولک اور پہاڑی علاقوں کے شہروں کا برآوردہ
ادمی گفت کہ من در آں لشکر با سلطان	شخص تھا اس کا لقب معین الدین تھا وہ کہتا تھا
غازی بودم، عدد سوار لشکر اسلام	کہ میں اس لشکر میں سلطان غازی کے ہمراہ تھا
در آں وقت صد و بیست ہزار برگستواں بود	اور اسلام کے لشکر کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار سوار تھی

شیخ اکرام نے ثقہ از معارف بلاد تولک و جبال" کو معلوم نہیں کس بنیاد پر "حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری"[1] تصور کر لیا۔

وحید میاں (شیخ وحید احمد مسعود) نے نہایت دقت نظر، محنت اور عصری و تاریخی پس منظر میں تحقیق و تدقیق کے ساتھ حضرت خواجہ کے حالات کا مطالعہ کیا ہے۔ اس موضوع پر فارسی اردو اور انگریزی میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ان کے پیش نظر رہا ہے وہ تاریخ کا صحیح ذوق رکھتے تھے۔ انہوں نے نقل در نقل کی روایت کو رد کرتے ہوئے درایت کی روشنی میں حضرت خواجہ کے صحیح حالات پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

ان کی کتاب "سوانح خواجہ معین الدین اجمیریؒ" ایک مفصل مقدمہ اور بائیس ابواب پر مشتمل ہے متن کتاب میں حسب موقع خاص خاص مآخذ پر تنقید و تبصرہ بھی کیا گیا ہے جس سے ان کی دقت نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔

کتاب کا مقدمہ اور اس کا تیرھواں باب تصوف اور تاریخ تصوف کے اعتبار سے نہایت اہم ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع پر انہیں کامل عبور حاصل ہے ان کے دلائل نہایت واضح ہیں۔ تصوف قبل از اسلام، دور صحابہ، تدوین حدیث، مشاجرات صحابہ، خلافت امویہ و عباسیہ، ائمہ اربعہ

[1] ملاحظہ ہو آبِ کوثر از شیخ محمد اکرام (فیروز سنز، لاہور ۱۹۵۲ء) صـ ۲۲۶۔

کی دینی خدمات، عباسی دور میں مختلف مسائل ونظریات کا ظہور اوران کا رد، تصوف کا تحریک کی صورت میں ظاہر ہونا اوراس کے ارتقا پر خوب روشنی ڈالی ہے۔ وحدت الوجود پر عالمانہ اور محققانہ انداز میں گفتگو کی ہے۔

حضرت خواجہ کے نام، مقام پیدائش، سنہ پیدائش، سفر، ہندوستان میں آمد، تبلیغ واشاعت، اخلاق وعادات غرض حیات خواجہ کا ایک حسین مرقع پیش کیا ہے، بلاشبہ فاضل مؤلف کی نہایت کامیاب کوشش ہے۔

سنہ ۱۹۶۰ء میں جب خاکسار بدایوں گیا تو انہوں نے اس کتاب کا مسودہ خاکسار کو مرحمت فرماتے ہوئے کہا۔

سپردم بتو مایۂ خویش را　　　تو دانی حساب کم وبیش را

مَیں نے سنہ ۱۹۶۱ء میں یہ کتاب سلمان اکیڈمی کراچی کی طرف سے شائع کرادی بمقام مسرت ہے کہ علمی وتاریخی حلقوں میں اس کتاب کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔ عرصہ سے یہ کتاب نایاب تھی جناب محترم حکیم محمد موسیٰ امرتسری صاحب کی تحریک پر میاں محمد زبیر احمد صاحب قادری سجادہ نشین حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ (رضا پبلی کیشنز۔ لاہور) اسے نہایت آب وتاب سے شائع کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں کامیابیوں اور کامرانیوں سے نوازے [1]

محمد ایوب قادری
۲۸ اگست سنہ ۱۹۸۳ء بروز اتوار
A/174/8
نارتھ ناظم آباد، کراچی

---

[1] فقیر میاں زبیر احمد نے یہ تعارف جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم سے جناب وحید احمد مسعود رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف "سوانح خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ" کیلئے لکھوایا تھا۔ بعد میں کتاب کی کتابت ضیاء القرآن پبلی کیشنز کو دے دی گئی۔ مگر انہوں نے یہ تعارف چھاپنا گوارا نہ کیا۔ کیوں؟ واللہ اعلم۔

اب جناب وحید احمد مسعود کی نئی تصنیف "سوانح مخدوم علاء الدین علی احمد صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ" کے ابتداء میں شامل کردیا گیا ہے۔ جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری کے خط کا عکس اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں۔

۱۸ / ۳ / ۸۳

A/174/8
نارتھ ناظم آباد
کراچی ۳۳

جناب محترم میاں صاحب۔ السلام علیکم

امید ہے مزاج بخیر ہوگا۔ آپ کے تعمیل ارشاد میں مقدمہ بعنوان تعارف برائے سوانح حضرت خواجہ معین الدین اجمیری حاضر خدمت ہے۔ میں تعمیل ارشاد میں دیر ہوگئی اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ آپ دیکھیں گے کہ اس میں سیاسی [illegible] بہرحال یہ تعارف جناب حکیم محمد موسیٰ امرتسری کو ضرور پڑھوا لیں۔ اور کتابت کی صحت کا خاص خیال رکھیں۔ [illegible]

[illegible]

محمد ایوب قادری

۷۸۶

سات سو چھیاسی

حق حق حق

آنچہ استادِ ازل گفت ھُماں می گویم

یارب تو کریمی و رسولِ تو کریم۔ مومن و کافر سب کی حاجت روا ئی

تو ہی کرتا ہے۔ تو جو چاہے تو اُٹھے سینۂ صحرا سے حباب۔ تو نے ہر شئے میں ازواج وضداد بنائے ہیں اور وحدہٗ لاشریک ہے۔ نرالا ہے تو اے مولیٰ کریم نرالی ہیں تیری شانیں۔ ہے زیبا تجھے سروری برتری۔ سُبحان اللہ و بحمدہٖ۔

یا رسُول کریم (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) حضُور پر تو مہر لا یزالی ہیں۔ حضُور صلی اللہ علیہ وسلم قرآن ناطق ہیں۔ حضور حاضر و ناظر ہیں۔ حضور صاحبِ خُلقِ عظیم ہیں حضور نے ہی مکمل طور پر ربُّ العزّت کی اَحدیّت و صمدیت کو سمجھایا ہے اور تمام جنّ و بشر کو سمجھائی ہے۔ حضور صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا اُسوۂ حسنہ دین و دُنیا کی بہتری کا واحد ذریعہ ہے۔ زیب دیتا ہے تمہیں جس قدر اچھا کہیے۔ حضور پر، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے آل و اہلِ بیت و اصحاب کو لاکھوں سلام۔

اللّٰھم صلّ علیٰ مُحمّد و آلہ بقدر حُسن جمالہ

صلے اللہُ تعالیٰ علیک یا مُحمّد

آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی تعلیم سے طریقت کے تین سلسلے مشہور و معروف ہیں۔ سلسلۂ خواجگان یا نقشبندیہ۔ یہ سلسلہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ

عنہ پر منتہی ہوتا ہے۔ دوسرا طریقہ حضرت مولیٰ علی کرم اللہ وجہہ سے چلتا ہے۔ اس کی کئی شاخیں ہوگئی ہیں تیسرے سلسلہ کو اویسیہ کہتے ہیں حضرت اویس قرنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بغیر خدمت میں حاضر ہوئے براہِ راست رسُول مقبول صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم سے فیض پہنچا تھا۔ لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انہیں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بیعت تھی واللہ اعلم۔

ہندوستان میں حضرت مخدوم علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء[1]) نے سب سے پہلے لاہور سے تعلیم طریقت کی اشاعت فرمائی۔ ان کی یہ کوشش واحد و شاید ہے مگر انفرادی ہے۔ ان کے اکیس بائیس سال بعد حضرت خواجہ معین الدین حسن سجزی چشتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اجمیر کو مرکز بنا کر ۵۸۷ھ/۱۱۹۱ء میں سلسلہ چشتیہ کی بنیاد رکھی۔ اس کے تیس سال بعد ۶۱۲ھ سے حضرت بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (متوفی ۵۰۸ھ) نے ملتان سے سہروردی سلسلہ جاری کیا۔ پھر مغربی پنجاب میں حضرت سید محمد غوث گیلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (متوفی ۹۷۰ھ/۱۵۶۲ء) نے سلسلہ قادریہ کی اشاعت کی۔ بعدہٗ اکبری عہد میں حضرت باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۰۱۱ھ/۱۶۰۳ء) نے نقشبندی سلسلہ کا اجراء کیا۔

سلسلہ چشتیہ معینیہ کی تیسری کڑی حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ ہیں جن کو حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ اعظم حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشی کے خلیفہ ہونے کا فخر حاصل ہے۔ حضرت بابا صاحب رحمۃُ اللہ علیہ کے بے شمار خلیفہ ہیں۔ جن میں تین بزرگوں کو فوقیت و فضیلت حاصل ہے۔ حضرت جمال الدین ہانسوی رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ اول ہیں۔ ان کا وصال حضرت بابا صاحب کے سامنے ۶۵۹ھ میں ہوگیا تھا۔ ان سے سلسلہ نہیں چلا۔ دوسرے خلیفہ اعظم حضرت مخدوم علاءالدین علی احمد صابر رحمۃُ اللہ علیہ ہیں۔ انہیں ۶۴۶ھ میں خلافت دے کر براہ راست

[1] کشف المحجوب ۴۸۰ھ کے بعد مکمل ہوئی تھی اس لیے حضرت کے وصال کی تاریخ بعد میں ہونی چاہیئے۔

کلیر کی ولایت سپُرد کی تھی۔ دہلی کی خلافت دینے کی افواہ محض الحاقی و فرضی ہے تیسرے خلیفہ اعظم حضرت سُلطان المشائخ سید نظام الدین بدایونی محبُوب الٰہی رحمۃ اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ ان کی بیعت ۶۵۴ھ میں ہُوئی تھی اور تین سال بعد خلافت عطا کر کے ولایت دہلی میں متعین کیا تھا۔ حضرت مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے جتنے بھی تذکرے ہیں ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ وہ سب عالم و فاضل تذکرہ نویسوں کی خوش عقیدگی اور شاعری کا نتیجہ ہیں جن کو حقیقت سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ ان سب تذکروں کی خامیاں احقر نے ۱۹۶۴ء میں اپنے رسالہ "جمال صابر" میں ظاہر کی تھیں۔ مگر اکثر عقیدت مندوں نے اس کو میری عقلیت پسندی پر محمول کیا۔ لہٰذا ایسے حضرات سے بصد ادب استدعا ہے کہ ان تذکرہ جات میں جو کرامتیں کہی گئی ہیں اُن کی تکذیب و تردید پہلے بھی کی جا چکی ہے۔ حضرت شیخ عبدالحق محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ۹۹۹ھ میں اپنی کتاب "اخبار الاخیار" میں ان تذکروں کے متعلق سب سے پہلے قلم اٹھایا تھا۔ پھر ۱۸۸۵ء میں سلسلہ جمالی کو ایجاد کرنے کی کوشش میں جناب خلیل الرحمٰن سرساوی صاحب نے ان روایتوں کی وجہ سے حضرت مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کے وجود سے ہی انکار کر دیا تھا۔ جواب میں صابری حضرات نے اعلان کیا تھا کہ "ہم ملفوظات کے مُنکر نہیں ہیں مگر ان مضامین کو مردود کرنے والے ہیں جو پیرانِ ناقص نے مشائخ سے نامزد کر دیئے ہیں[1]" غرض اگلے صابری بزرگوں نے مخالفین کے اعتراض دور کرنے کی کوشش کی تھی اور میں معتقدین کے مغالطے دور کرنا چاہتا ہوں۔ پہلے زمانہ کے صوفیوں نے اغیار کے اثرات و معتقدات قبول کر کے جادُو ٹونوں اور سیمیا کو منجملہ کمالات سمجھ لیا تھا اور ان کی دیکھا دیکھی ایسی ہی مصنوعی کرامتیں اپنے بزرگوں سے منسوب کر دیں۔ علم سیمیا حکمائے اشراقین

[1] "قول فیصل" مصنفہ صوفی محمد جان صابری مرادآبادی۔

کی ایجاد ہے۔ وہ اپنی روح کو دوسرے کے قالب میں پہنچا دیتے تھے۔ اپنی آواز دُور دراز مقامات تک پہنچا سکتے تھے اور ہر شکل اختیار کر سکتے تھے۔ اس علم کے حاصل کرنے کے لیے سخت مجاہدے کرنا پڑتے تھے۔ مَیں جانتا ہوں کہ وراثت میں پائی ہُوئی عقیدتمندی مشکل سے دور ہو گی۔ مگر ان شاء اللہ تعالیٰ دُور ہو گی اور ضرور دُور ہو گی۔ وما توفیقی اِلا باللہ۔

اس کتاب کی تدوین و ترتیب میں جن صاحبان نے میری ہمت افزائی کی ہے اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے۔

جناب حاجی حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری لاہور ○ جناب حکیم قریش احمد صاحب قدس سرہٗ سجادہ نشین گنگوہ ○ جناب حضرت آفاق احمد صاحب قبلہ سجادہ نشین ردولی شریف ○ جناب غلام حسین صاحب مرحوم سجادہ نشین خانقاہ سلیمانیہ پھلواری شریف ○ جناب حکیم اسلام الحق صاحب سجادہ نشین حضرت عبدالباری رحمۃ اللہ علیہ امروہہ۔ ○ جناب شاہ معین الدین صاحب جعفری سجادہ نشین حضرت عضد الدین امروہہ۔ ○ جناب خواجہ حسن ثانی صاحب ایڈیٹر منادی دہلی ○ جناب پروفیسر محمد ایوب قادری ایم اے کراچی ○ جناب مرزا وحید الدین بیگ صاحب اجمیر ○ جناب ماسٹر طیب بخش ایم اے رئیس بدایوں ○ جناب ڈاکٹر لطیف حسین صاحب ادیب بریلی ○ جناب ماسٹر شہاب الدین صاحب مدرس شیخوپورہ ○ جناب آل احمد نوری صاحب وکیل بدایوں

ممنونِ کرم بندۂ بے درم
غلام غلامانِ آلِ محمد
وحید احمد مسعود قطبی وصابری

ابتدائی حالات

آنانکہ وصفِ حُسنِ تو تفسیر می کُنند　　خوابِ ندیدہ راہمہ تعبیر می کُنند

اس سے انکار ممکن نہیں کہ حضرت مخدوم پاک رحمۃُ اللہ تعالیٰ علیہ کے متعلق تذکرہ نویسوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ قیاسی و سماعی ہے۔ اسی وجہ سے ان کی عظیم الشان شخصیّت کا صحیح تعارف نہیں کیا جا سکا۔ ہوا یہ کہ جو واقف تھے انہوں نے سکوت اختیار کیا اور جو شائق تھے وہ فروعات میں مبتلا ہو گئے۔ ہر زبان پر نئی کہانی ہے۔ ہر کتاب میں انوکھی داستان ہے۔ یہ اختلاف یوں ہوئے کہ حقیقت تک رسائی نہ ہو سکی۔ معدوم وہ ہے جو نہ پایا جائے۔ جو شے تواتر کے ساتھ پائی جائے اُسے موہوم کہا جاتا ہے اور موجود اس کو کہتے ہیں جو پایا بھی جائے اور تواتر بھی رکھتا ہو۔ ظاہر ہے کہ حضور مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے چرچے ہر زمانہ میں رہے ہیں اور دُوسرے سلسلہ کے بزرگوں نے ادب و تعظیم سے ان کا اعتراف کیا ہے اور یہ کھُلی ہُوئی حقیقت ہے کہ ان کا سلسلہ جاری ہے نہ صرف یہ بلکہ روحانی صورت سے لوگوں کو مستفیض بھی کیا کرتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے متعلق ایسی بے سروپا روایتیں کیوں گھڑی گئیں۔ یہ امر کہ صحیح حالات فراہم نہ ہو سکے تو یہ معتقدین اور تذکرہ نگاروں کا قصور رہے۔ انہوں نے اپنے مزاج کے مطابق قیاسوں اور تاویلوں سے کام لیا ہے لیکن ظنیات کا حقیقت سے رابطہ و تعلق نہیں ہوا کرتا۔

دیکھنے کا تو مزہ یہ ہے سراپا دیکھے — دیکھ کر پاؤں ترا منہ نہ کسی کا دیکھے

معرفت مشاہدات سے حاصل ہوا کرتی ہے اور اسی سے یقین پیدا ہوتا ہے مخدوم پاک رحمۃُ اللہ تعالیٰ ولی تھے۔ لیکن سب ولی ایک سے نہیں ہوتے۔ ولیوں کے اقسام و مدارج ہیں۔ اس کے علاوہ اہل وطن کا معاملہ اہل ظاہر سے مختلف ہوتا ہے۔ دنیا والے رسُوم کے پابند ہوتے ہیں اور اولیاء کو رسُوم سے واسطہ نہیں ہوتا۔ طریقت والے نام، نسب۔ وطن مولد و مدفن سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ تصوف رسم نہیں بلکہ اخلاق ہے۔ چشتیہ سلسلے کے بعض جلیل القدر بزرگوں کے پورے حالات آج تک معلوم نہیں ہو سکے۔ حضرت خواجہ حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہُ کے والد کا نام اور پتہ کسی کو نہیں معلوم۔ خواجہ عبدالواحد بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کے حسب و نسب پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ خبر نہیں کہ حضرت فُضَیل بن عیاض کا وطن کس جگہ ہے اور سب سے زیادہ حیرت ہے کہ کسی کو نہیں معلوم کہ حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سیّد ہیں یا فاروقی ہیں۔ مگر ان لاعلمیوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے ان بزرگوں کی خلافت۔ ولایت اور عظمت میں کسی طرح بھی کوئی فرق نہیں آتا۔ اجماع سے ثابت ہے کہ حضرت مخدوم پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت بابا صاحب کے بھانجے، داماد اور خلیفہ تھے اور ولایت کلیر ان کو تفویض کی گئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی پیدائش سے پہلے حضرت مولیٰ علی کرم اللہ وجہہٗ نے خواب میں بشارت دی تھی کہ مولود کا نام "علی" رکھنا۔ پھر سرکار دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا عالمِ رویا میں ارشاد ہوا کہ نام احمد ہونا چاہیئے۔ وقت تسمیہ کسی بزرگ نے نام علاء الدین تجویز کیا۔ بقول "سیر الاقطاب" دربارِ الٰہی سے مخدوم کا خطاب عطا ہوا۔ اور بابا صاحب نے صابر کا لقب مرحمت فرمایا۔ ان اسماء کی کثرت میں وحدت جلوہ نما ہے۔ مدعا یہ کہ نام کتنے ہی ہوں مگر

ذات اصل شے ہے۔

ہر کجا نام اُوست قربانیم — عاشقاں راچہ کار با تحقیق

مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کے نسب کے متعلق بھی اختلاف ہے کوئی حسنی کہتا ہے کوئی حسینی خیال کرتا ہے۔ کسی نے انہیں ہندی بتایا ہے اور کسی نے یہودی النسل سمجھا ہے۔ معتبر یہ ہے کہ سیّد ہیں۔ حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ہمشیرہ بی بی ہاجرہ کی شادی حضرت غوث پاک کے خاندان میں ہوئی تھی۔ لہٰذا بجا طور پہ کہا جا سکتا ہے کہ سیّد ہیں۔ ظاہری اور کشفی دونوں تذکروں کا متفقہ بیان ہے کہ بی بی ہاجرہ کی شادی غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پوتے شیخ عبدالرحیم سے ہوئی تھی۔ لیکن شیخ عبدالرحیم بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے عمر میں تیس سال بڑے تھے۔ لہٰذا اس سنہ و سال کے فرق کی وجہ سے جلال صابری کے مؤلف الٰہی بخش صابری کی تحقیق ہے کہ بی بی ہاجرہ کی شادی شیخ عبدالرحیم سے نہیں بلکہ ان کے صاحبزادے شیخ عبداللہ سے ہوئی تھی۔ اب شیخ عبداللہ کے متعلق بھی اختلاف ہے۔ ماہر انساب مُلّا وجیہ الدین کا خیال ہے کہ شیخ عبداللہ شیخ فتح اللہ کے صاحبزادے تھے جو امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد و امجاد سے تھے۔ اس لیے ان کا تعلق حسینی شاخ سے تھا آگے چل کر مُلّا صاحب نے لکھا ہے کہ "۵۹۳ھ / ۱۱۹۷ء میں ان شیخ عبداللہ کی شادی بی بی ہاجرہ سے بمقام کھوٹوال عہدِ خلجی میں ہوئی تھی۔" عہد خلجی ۶۸۶ھ / ۱۲۸۷ء سے شروع ہوتا ہے اور مخدوم پاک کا وصال ۶۷۹ھ / ۱۲۸۰ء میں عہد بلبن میں ہو چکا تھا۔ اندریں حالات مُلّا صاحب کی یہ کل روایت قابل تسلیم نہیں ہو سکتی۔ جو لوگ مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کو ہندی نژاد کہتے ہیں وہ انکی جائے ولادت قصبہ ڈیگری ضلع حصار قرار دیتے ہیں۔ مگر اس کا ثبوت نہیں اور انکے بیانات مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ پر منطبق بھی نہیں ہوتے۔ پیر محمد حسین ولد پیر تاج الدین محمود چشتی اجودھنی نے "وقائع فرید الدین چشتی" میں مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ولادت کھوٹوال میں لکھی ہے اور قطب وقت مولانا اکرم براسوی

نے اپنی کتاب "اقتباس الانوار" میں بغیر کسی حوالے اور سند کے ولادت کی جگہ گنجہ بتائی ہے۔ جو یہودیوں کی بستی تھی۔ اسی وجہ سے وہ مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کو یہودی النسل تصوّر کرتے ہیں۔ یہ سب بے پر کی کہانیاں ہیں۔ صحیح یہی ہے کہ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ حسنی سیّد ہیں، ہرات میں پیدا ہوئے تھے اور ان کے والد شیخ عبداللہ ولد شیخ عبدالرحیم تھے یعنی شیخ عبداللہ حضور غوث پاک رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے پر پوتے تھے والدہ کی طرف سے مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ حسینی تھے۔

مخدوم کے ابتدائی حالات ظاہری تذکروں میں مُبہم ہیں مگر کشفی تذکروں میں تفصیل کے ساتھ ملتے ہیں۔ ظاہری تذکرے پہلے لکھے گئے ہیں اور کشفی تذکرے بعد کی پیداوار ہیں۔ الہامی ہونے کی وجہ سے ان کو ہی معتبر سمجھا جاتا ہے مگر ان کی روایتیں معمّہ ہیں نزاع ہانسی کا ان میں کوئی ذکر نہیں ہے شیخ کبیر کی زوجہ اولےٰ اور زوجہ ثانی کے متعلق صاحب حقیقت گلزار صابری گول ہیں۔ ان کے خلیفہ نے "عترت فریدی" میں ازواج کی بابت جو لکھا ہے وہ قرین قیاس ہے۔ اور اس کی شہادت تاریخ سے بھی مل جاتی ہے لیکن صاحب حقیقت گلزار صابری شیخ کبیر کی اہلیہ کو بلبن کی صاحبزادی بناتے ہیں اور یہ قطعی غلط ہے۔ بہرحال امتثال امر کیلئے "گلزار حقیقت صابری" سے کچھ اقتباس اگر یہاں پیش کر دیا جائے تو اہلِ نظر اس سے خود رائے قائم فرما سکتے ہیں۔ ملاحظہ ہو :-

حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان ذوالنورین، حضرت علی المرتضےٰ، حضرت انس بن مالک، حضرت عبدالعزیز بن حارث رضوان اللہ تعالےٰ عنہم اجمعین نے اپنے اپنے جداگانہ مکاتیب میں یہ روایت تحریر فرمائی ہے کہ حضور سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتّحیات ۱۲ ربیع الاوّل سنہ۱ھ کو جمعہ کی رات میں بعد فراغ نماز عشاء ہمیں

ہمراہ لے کر مسقط کی جانب روانہ ہوئے۔ کچھ دُور چل کر ایک درخت کے نیچے قیام فرمایا پھر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے کچھ چہل قدمی فرمائی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسُول اللہ! حضور کے بعد سلسلہ کی تعلیم کس طرح چلے گی۔ ارشاد فرمایا کہ "اللہ تعالےٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ تیری اُمت سے اولیاء پیدا کروں گا۔ امت کے لوگ تعلیم طریقت کے سلسلے میں پریشان نہیں ہوں گے۔ اس کے بعد فرمایا کہ تحقیق کے ساتھ کہتا ہوں کہ خداوند جل علیٰ خالقِ ارواح نے عالم ازل میں تمامی ارواح کو چار حلقوں میں کھڑا کیا اور جملہ ارواح کو مدارج عطا فرمائے۔ اس وقت مخدوم علی احمد صابر کو مُہر ولایت پسِ پشت سیدھے شانے کے پیچھے۔ جگر کے اوپر کہ یہ مقام فنا فی اللہ کا ہے۔ لگائی۔" حضرت عمر فاروق نے التماس کیا کہ یا رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ روح کس زمانہ میں ظہُور پذیر ہوگی اور اس کی کیا کیفیت ہوگی۔ ارشاد فرمایا "کہ یہ اولاد علی المرتضےٰ میں حسنی و حسینی ہوگا۔ اپنے وقت کا لاثانی مجدّد ہوگا اس کا ظہُور چھٹی صدی ہجری میں ہوگا۔ شان جمال سے شان جلال زیادہ ہوگی۔" اسی طرح حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے ۱۱ رجب المرجب سنہ۴۸ھ کو اپنے مکتوب نطاب "کشف الغیوب" میں پوری تفصیل کے ساتھ تحریر فرمایا ہے کہ عالمِ رویا میں نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بتایا کہ "...... یہ دوسری روح جو میرے بائیں زانو پہ ہے اس کا ظہُور دائیں زانو والی روح (یعنی غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد ہوگا۔ اس کا نام مخدوم علی احمد صابر ہوگا۔ اس کو ولایت اَتم کا درجہ حاصل ہوگا۔ اس کی ولایت قہر کی شان ہوگی ......" حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے مکتوب نطاب "گُربۃ الوحدت" میں کہا ہے کہ حضرت بی بی فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے خواب میں فرمایا کہ اے فرزند! خدائے عزّ و جل نے مجھ کو حسن و حسین کے عوض میں ایک تم کو اور دوسرے

علی احمد صابر کو عطا فرمایا ہے۔ اور قریب ہے کہ عبدالوہاب اور عبدالرحیم کے (جو تیری اولاد ہیں) گھر میں ظہور پذیر ہوگا۔ ان حضرات کی مسلسل پیشین گوئیوں کے علاوہ حضرت باباصاحب کے والد مولوی محمود سلیمان رحمۃ اللہ علیہ اپنے مکتوب نطاب میں رقم طراز ہیں کہ انہوں نے اپنے دوست حضرت محمد اسحاق ہراتی کو تحریر فرمایا تھا کہ میں نے ایک شب خواب میں دیکھا کہ حضرت احمد مجتبےٰ محمد مصطفےٰ شہنشاہ ہر دوسرا صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم مجھے ارشاد فرما رہے ہیں کہ عبدالرحیم اولادِ غوث پاک محی الدین جیلانی رحمۃ اللہ علیہ شہر ہرات میں آتا ہے تم اپنی دختر نیک اختر موسومہ ہاجرہ کا نکاح اس کے ساتھ کر دینا"۔ حضرت عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ اپنے مکتوب نطاب "مصور الودود" میں لکھتے ہیں کہ گیارہویں ذیقعد ۵۴۱ھ کو دو شنبہ کے دن سہ پہر کو عبدالرحیم عبدالسلام پیدا ہوئے۔ وہ پیدائشی مجذوب تھے۔ اسی وجہ سے ظاہری تعلیم کی تکمیل نہ کر سکے۔ حضرت غوث پاک رحمۃ اللہ علیہ پیار میں انہیں "میرے مست مجنون جلالی" کہا کرتے تھے۔ جب اُنکی عمر اٹھارہ سال کی ہوئی تو میں نے بیعت توبہ کرائی اور امامت ارشاد سے ایک ہی وقت میں مشرف کر دیا۔ اب جذبہ اتنا بڑھا کہ حواس و عقل نے جواب دے دیا۔ تیرہ دن کے بعد ۵۵۸ھ کی شب پنجشنبہ میں تہجد کے وقت بغیر کہے سُنے ایک سمت کو چل دیئے۔ اور آنکھوں سے اوجھل ہوگئے۔ پریشان ہو کر میں نے علیم اللہ ابدال کو ان کی تفتیش و حفاظت کے لیے مقرر کیا۔ گیارہ ماہ بعد ۵۵۹ھ میں عیدالاضحیٰ کے دن بروز شنبہ عشا کی نماز کے قبل علیم اللہ ابدال خبر لایا کہ پتہ چل گیا۔ ہرات میں محمد اسحاق کے مکان میں مقیم ہیں اور طبیعت اصلاح پر ہے۔ شاہ عبدالرحیم نے خود اپنی کتاب "انوار الشہود" میں لکھا ہے کہ بتاریخ پنجم ماہ ذوالحجہ ۵۵۹ھ کو چہار شنبہ کو ظہر کے وقت ہرات میں داخل ہوا۔ محمد اسحاق نے بڑی تعظیم کے ساتھ اپنے یہاں ٹھہرایا۔ پھر

انہوں نے میری آمد کی خبر حسب وعدہ مولوی محمود عرف سلیمان کو بمقام کھوٹوال لکھ بھیجی۔ کچھ عرصہ بعد وہاں سے شیخ فرید شکر گنج کا خط آیا کہ مولوی محمود عرف سلیمان نے خوشخبری سن کر سجدۂ شکر ادا کیا اور جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ خوشی اس بات کی تھی کہ حسب مرضئ نبوی (صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم) بی بی ہاجرہ کی شادی شیخ عبدالرحیم سے ہو سکے گی"۔ اس وقت بی بی ہاجرہ تین سال کی تھیں۔ محمد اسحاق نے دس برس شاہ عبدالرحیم کو اپنے پاس رکھا اور اس عرصہ میں وہ علوم ظاہری کی تکمیل فرماتے رہے۔ انوار الشہود۔ ارکان الشہود اور طہرت نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ عبدالرحیم کا نکاح بمقام کھوٹوال ۱۷ جمادی الاول ۵۷۱ھ کو پنج شنبہ کے دن بعد نماز عشاء حضرت باباصاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک پہ ہوا تھا[1] اور بعد نکاح کھوٹوال میں ان کا قیام اٹھارہ ماہ رہا۔ پھر مع اہلیہ محترمہ۔ مولانا ابوالقاسم گرگامی اور علیم اللہ ابدال کے ہرات واپس جا کر محمد اسحاق کے مکان میں فروکش ہوئے۔

مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت کے احوال ظاہری تذکروں میں اس طرح مندرج ہیں کہ شکمِ مادر میں ذکر بالجہر کرتے تھے ۱۲ ماہ کے بعد ۱۹ ربیع الاول کو شب پنجشنبہ میں تہجد کے وقت تولد ہوئے۔ غسل کے وقت دائی نے ہاتھ لگایا تو اس کے جسم میں آگ کا شعلہ دوڑ گیا۔ پھر توبہ و وضو کر کے اس نے غسل کروایا..... اس عرصہ میں مکان کی چھت شق ہوگئی۔ متقدس روحیں۔ رجال الغیب غوث قطب و ابدال مبارک باد دینے کو آئے اور پیشانی پہ بوسہ دے کر واپس چلے گئے... اب کسی دن اتفاقیہ چھت سے ایک سانپ گرا مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے دو ٹکڑے کر دیئے..... صبر و قناعت

[1] تاریخ کہتی ہے کہ حضرت باباصاحب ۵۶۹ھ (۱۱۷۱ء) میں پیدا ہوتے تھے اور کشفی تذکرہ کا ارشاد ہے کہ شاہ عبدالرحیم کا نکاح باباصاحب کی تحریک سے ۵۷۱ھ میں ہوا تھا جب کہ ان کی عمر دو سال کی تھی۔ واللہ اعلم۔

کے آثار نمایاں تھے۔ شیر مادر کئی کئی دن کے بعد پیتے تھے۔ رضاعت ڈھائی سال کی ہوتی ہے مگر انہوں نے صرف چھ مہینے دودھ پیا۔ بعد کو سوکھی روٹی اور پانی سے افطار کرتے تھے۔ پانچ سال کے ہوئے تو والد رحلت فرما گئے۔ کم سوتے تھے۔ زمین پر لیٹتے تھے۔ صائم الدہر و قائم الیل تھے۔ ساتواں سال بڑی حسرت میں کٹا۔ والدہ سے کھانے کو مانگا تو کچھ نہ تھا۔ انہوں نے خالی دیگچی چولہے پر چڑھا کر تسلی دی کہ چاول پک جائیں تو کھانا۔ بھوک کی شدت سے بیتاب ہو کر مخدوم نے دیگچی کھول کر دیکھی تو چاول پک چکے تھے اور ان میں سے نہایت تیز خوشبو نکل رہی تھی۔ والدہ کو سخت حیرت ہوئی کہ چاول کہاں سے آ گئے۔ پھر یہ چاول سب میں تقسیم بھی کر دیئے اس طرح کی روزانہ کی کرامتیں دیکھ کر والدہ ماجدہ نے طے کیا کہ روحانی تعلیم کے لیے انہیں بھائی کی خدمت میں لے جایا جائے۔ کشفی تذکرہ کا بیان ہے کہ بی بی ہاجرہ ابوالقاسم گرگامی کی معیت میں اجودھن کو چلیں۔ راہ میں علیم اللہ ابدال ملے۔ انہوں نے کہا کہ ابھی تک پوشیدہ رہ کر خدمت کرنے کا حکم تھا۔ اب علانیہ عمر بھر ساتھ رہے گا۔ غرض یہ قافلہ ۱۵ شعبان ۵۶۰ھ/۱۱۶۲ء کو یہ برکت اسم اعظم جنیدیہ گیارہ روز میں اجودھن پہنچا[1]۔ اس وقت مخدوم کی عمر آٹھ سال کی تھی۔ اور لکھا ہے کہ اس سال بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو خلافت ملے ہوئے دو سال ہوئے تھے[2]۔ بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خوش آمدید کہتے ہوئے فرمایا کہ عالم رویا میں مجھے خبر دی گئی تھی کہ یہ طفل نوخیز اولیاء اللہ میں یکتا و بے مثال ہو گا۔ چنانچہ میں منتظر تھا۔ اب تم سب یہاں تین برس ٹھہرو۔ اس عرصہ میں بلند اقبال کو علوم ظاہری کی تحصیل اور علوم باطن کی تکمیل کروا دی جائے گی۔ بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مکتوب نطاب میں لکھا ہے کہ برخوردار علاء الدین نے تین سال

---

[1] سال ولادت ۵۹۲ھ بتایا ہے اور اجودھن ۵۶۰ھ میں پہنچے ہیں۔ اس کو کوئی ولی ہی سمجھ سکتا ہے۔

[2] مگر حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو خلافت ۶۱۲ھ/۱۲۱۵ء میں ملی تھی۔

عربی و فارسی کتب متداولہ۔ فقہ حدیث۔ تفسیر۔ منطق و معانی وغیرہ پڑھیں اور یہ سب علوم اس تیزی سے حاصل کیے کہ کوئی دوسرا لڑکا پندرہ سال میں بھی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ تین سال میں جب ظاہری علوم کی تکمیل ہو چکی تو بتاریخ ۱۴ شوال ۶۰۳ھ میں بہ عمر گیارہ سال بیعت طریقت سے مشرف فرمایا۔ اور فاتحہ تبرک تقسیم کیا۔ پھر مخدوم کو حجرے میں بٹھا دیا۔ اب بی بی ہاجرہ نے واپسی ہرات کی اجازت مانگی۔ جاتے جاتے ۶۰۳ھ میں انہوں استدعا کی تھی کہ بچے کو کھانے کی تکلیف نہ ہو۔ بہن کو مطمئن کرنے کے لیے اسی وقت صاحبزادے کو لنگر خانہ کا منتظم مقرر کر دیا۔ بی بی ہاجرہ نے بوقت وداع یہ بھی کہا تھا کہ اس کی شادی کر کے بارہ برس کے بعد میں پھر یہاں آؤں گی۔ اپنے مکتوب نطاب سر العبودیت میں بابا صاحب نے لکھا ہے کہ گیارھویں ذیقعد ۶۰۳ھ کو بروز جمعہ فجر سے پہلے علی احمد کے رونے کی آواز میں نے سنی۔ سمجھا کہ والدہ کی جدائی کی وجہ سے رو رہا ہے۔ لیکن دریافت کرنے پر وجہ یہ بتائی کہ دنیا مجھ سے چھوڑائی جا رہی ہے۔ حکم ہوا ہے کہ آئندہ بجز اولیاء اللہ اور رجال الغیب کے کوئی تیرے پاس نہیں آئے گا۔ غرض اس کیفیت میں مستقل طور پر محویت طاری ہو گئی[4] اور ذات مطلق کے سوائے کسی دوسری طرف توجہ نہیں رہی۔ سر العبودیت میں یہ بھی تحریر ہے کہ ۷ محرم ۶۱۰ھ کو بروز شنبہ وقت زوال میرے سہ[3] سالہ فرزند نعیم الدین نے مخدوم کے حجرے کے اندر جھانکا۔ اسی وقت خون کی قے ہوئی اور جان بحق ہو گیا یکم صفر ۶۱۰ھ بروز جمعۃ المبارک دوسرے یک سالہ فرزند فرید بخش نے حجرے کے رخ پیشاب کر دیا تو بچھو نے اسے کاٹا اور ایک پہر کے بعد دم توڑ گیا۔ بارھویں صفر ۶۱۰ھ کو میرے تیسرے بائیس سالہ لڑکے عزیز الدین نے بھنڈاری کی ممانعت کے باوجود وقت سے پہلے لنگر تقسیم کر دیا۔ جب مخدوم برآمد ہوئے اور یہ قصہ سنا تو فرمایا لنگر باقی نہیں رہا مگر عزیز الدین باقی ہے۔ اسی وقت عزیز الدین کی روح پرواز کر گئی اور گھر

میں کہرام پڑ گیا۔ علیم اللہ ابدال نے فی الفور ہرات پہنچ کر ان حادثات کی بی بی ہاجرہ کو خبر کی۔ بی بی ہاجرہ ۱۹ جمادی الاول ۶۱۲ھ کو اجودھن آئیں۔ مرحوم بچوں کی تعزیت سے فارغ ہو کر مناسب موقع پر صاحبزادے کی لاغری کا ذکر کیا۔ جواب دیا تمہارے سامنے لنگر خانہ کا منتظم مقرر کر دیا تھا۔ انہیں کھانے کی کیا کمی تھی۔ مخدوم پاک نے فی البدیہہ عرض کیا مگر کھانے کی اجازت کب دی تھی۔ باباصاحب یہ جواب سن کر خوشی سے اُچھل پڑے۔ علی احمد کو پیار کیا اور صابر کا خطاب دیا۔ بہن صاحبہ کی تسکین یوں کی کہ یہ کھانے کے لیے پیدا نہیں کیئے گئے ہیں۔

جب بی بی ہاجرہ نے صاحبزادی کے لیے پیغام دیا تو حضرت نے فرمایا انہیں شادی کی ضرورت نہیں ہے لیکن ہمشیرہ کے اصرار سے کرنا ہی پڑی۔ لہٰذا ۲۱ شوال ۶۱۲ھ کو مابین عصر و مغرب نکاح پڑھوا دیا گیا[1]۔ شب کو والدہ ماجدہ نے دولہن کو حجرے کے اندر پہنچایا۔ نوشہ صاحب مراقبۂ فنا سے ہوشیار ہوئے تو پوچھا تم کون ہو۔ عرض کیا کہ آپ کی زوج ہوں۔ فرمایا خداوند ذوالجلال والاکرام فرد ہے اور ان جھگڑوں سے پاک ہے۔ یہ الفاظ منہ سے نکلنا تھے کہ زمین سے ایک شعلہ اٹھا اور دولہن کو خاکستر بنا گیا۔ (ایک روایت یہ بھی ہے کہ دولہن انوار کی تاب نہ لا سکیں اور مر گئیں) اس روح فرسا واقعہ پر والدہ نے مخدوم کی پُشت پر دوہتڑ مارا کہ اے سوختہ سامان تیرے ماموں کو میں کیا جواب دونگی۔ ندامت کے ساتھ مخدوم نے عرض کیا کہ مجھے بالکل خبر نہیں کیا ہوا اور کیسے ہوا۔ آخر کار باباصاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ عنہ نے ہمشیرہ کو تسلی دی کہ مرضی الٰہی یہی تھی۔ صبر کرنا چاہیئے اس حادثہ اور دوہتڑ مارنے کا اثر یہ ہوا کہ بی بی ہاجرہ بیمار ہو گئیں اور ۲ محرم ۶۱۴ھ کو جمعہ کے دن بعد مغرب رحلت فرما گئیں[2]۔ مخدوم حجرے سے تقسیم لنگر کے لیے برآمد ہوتے

[1] بی بی ہاجرہ کی آمد اور مخدوم کے نکاح کی تاریخوں میں فرق ہے۔
[2] اس سال کشفی دنیا میں محرم جمادی الاول سے پہلے آیا تھا۔

تو بھنڈاری نے والدہ کے انتقال کی خبر سنائی۔ سنتے ہی حجرے میں واپس گئے اور ۹ سال تک باہر نہیں آئے۔

اس کشفی بیان میں مندرجہ ذیل اذکار قابلِ توجہ ہیں۔

(۱) شیخ عبدالرحیم پیدائشی مجذوب تھے۔ انہیں بیعت توبہ اور امامت ارشاد سے نوازنا تعجبات سے ہے۔

(۲) بعد نکاح شیخ عبدالرحیم کھوٹوال میں اٹھارہ مہینے رہے اور مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بجائے نو ماہ کے بارہ مہینے بعد پیدا ہوئے اس طرح گویا جائے ولادت کھوٹوال ہے

(۳) مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے اجودھن پہنچنے سے دو برس پیشتر باباصاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو خلافت کا ملنا مذکور ہے لیکن خلافت ملنے کا صحیح سال ۶۱۳ھ / ۱۲۱۵ع ہے۔

(۴) صاحبزادے کو جملہ عُلوم سے تین برس میں فارغ کر دینے کا وعدہ فرمایا تھا مگر اس مدت میں محض ظاہری تعلیم دی۔

(۵) بی بی ہاجرہ ۶۱۴ھ میں ہرات سے اجودھن بارہ برس سے کچھ قبل آگئیں شاید حادثات کی خبر سُن کر۔

(۶) باباصاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے باوجود انکار کر دینے کے ہمشیرہ کے اصرار سے مجبور ہو کر اپنی صاحبزادی کی شادی مخدوم رحمۃ اللہ علیہ سے کر دی۔

(۷) بی بی ہاجرہ کا انتقال صاحبزادے کا نکاح پڑھوا دینے کے بعد محرم ۶۱۴ھ میں ہوا۔ وہ ہرات سے جمادی الاول ۶۱۴ھ کو آئیں گویا ان کی رحلت کے چار پانچ ماہ بعد نکاح ہُوا۔

(۸) والدہ کے انتقال کی خبر سُن مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نو برس حجرے سے باہر نہیں نکلے۔ نتیجہ یہ کہ وہ منتظم لنگر بارہ برس سے زائد رہے۔

کشفی تذکروں کی اس بے سروپائی پر جو اعتماد رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ ان پر رحم کرے۔ ظاہری اور کشفی تذکرے متفق ہیں کہ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ آٹھ سال کی عمر میں اجودھن لائے گئے تھے لیکن کشفی تذکرے طے نہ کر سکے کہ ۵۶۰ھ میں لائے گئے تھے یا ۶ھ میں اسی طرح ان کا الہام جائے ولادت کا بھی تعین نہ کر سکا۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ حضرت خواجہ غریب نواز اجمیر شریف ۵۸۷ھ/۱۱۹۱ء میں آئے تھے ۵۸۹ھ/۱۱۹۹ء میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ نے ملتان کا دورہ کیا تھا اس وقت مولانا منہاج الدین کی مسجد میں باباصاحب رحمۃ اللہ علیہ کو "نافع" پڑھتے دیکھا تھا۔ اس وقت باباصاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عمر بیس سال کی تھی۔ اس حساب سے باباصاحب رحمۃ اللہ علیہ کا سال ولادت ۵۶۹ھ ہو جاتا ہے۔ پھر قندھار میں تعلیم سے فارغ ہو کر ۵۹۳ھ میں مغرب کی جانب طویل سفر پہ گئے تھے۔ سیاحت کے بعد ۶۱۱ھ میں حضرت بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ سے ملتے ہوئے کھوتوال آئے اور کچھ دن قیام کر کے حضرت بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں دہلی گئے۔ وہاں حضرت بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں ۶۱۲ھ میں خلافت مرحمت فرمائی۔ ۶۲۱ھ/۱۲۲۴ء تک وہیں دہلی میں رہے۔ اس کے بعد ۶۳۴ھ/۱۲۳۷ء تک ہانسی میں قیام فرمایا۔ یہاں سے اسی سال یا کچھ دن بعد اجودھن پہنچے اور وصال تک وہیں رونق افروز رہے۔ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ مجاہدات وسیاحت کی وجہ سے حضرت باباصاحب رحمۃ اللہ علیہ کسی قسم کی ذمہ داری نہ کھوتوال میں لے سکتے تھے اور نہ دہلی میں۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ آٹھ سال کی عمر میں اجودھن لائے گئے اور وہاں تشریف آوری کا سال ظاہری تذکروں کے مطابق ۵۳۵ھ کے بعد قرار دیا گیا تو بھونچال آ جائے گا۔ البتہ ہانسی میں حضرت باباصاحب رحمۃ اللہ

علیہ کو فراغت حاصل تھی۔ وہ حضرت بدرالدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے ساتھ دعوتوں میں شریک ہوتے تھے۔ حضرت نورترک رحمۃ اللہ علیہ کے وعظ سنا کرتے تھے بیوی بچوں کی نگہداشت کرتے تھے اور شاگردوں اور مریدوں کی تربیت فرماتے تھے۔ اسی جگہ اسی زمانہ میں حضرت جمال الدین ہانسوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت منتخب الدین رحمۃ اللہ علیہ کو خلافت سے مشرف فرمایا تھا لہٰذا بجا طور پہ کہا جا سکتا ہے کہ مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ یہیں ہانسی میں لائے گئے تھے۔ اگر ہانسی میں ان کا سال ورود ۶۲۱ھ/۱۲۲۴ء مان لیا جائے تو ظاہر ہے کہ وہ ۶۱۳ھ/۱۲۲۶ء میں پیدا ہوئے۔

بی بی ہاجرہ کی دوبارہ حاضری سے پہلے بتایا گیا ہے کہ مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت باباصاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تین صاحبزادوں کو اجل کی نذر کر دیا تھا اس سے انکی قنائیت کا پتہ چلتا ہے۔ جب ایسی محجوبیت تھی تو خدا جانے لنگر کا انتظام کس طرح کرتے تھے۔ بی بی ہاجرہ کے دوبارہ آنے کی وجہ نہ مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کی شادی کا تصوّر ہے۔ نہ تین صاحبزادگان کے حادثات کی تعزیت ہے بلکہ درحقیقت والدہ ماجدہ کے وصال کا سانحہ ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ۶۳۲ھ کے بعد باباصاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قیام اجودھن میں مستقل طور پہ ہو گیا تو حضرت متوکل رحمۃ اللہ علیہ کو والدہ کو لانے کے لیے کھوتوال بھیجا تھا۔ جب وہ لاہور تھے تو اثنا۔ راہ میں ایک درندہ ضعیفہ کو اٹھا لے گیا۔ یہ سانحہ ۶۳۶ھ/۱۲۴۹ء کے قربِ وجوار کا قیاس کیا جا سکتا ہے۔ مگر کشفی تذکروں میں ان کا سالِ وصال ۶۴۴ھ درج ہے اور یہ سراسر غلط ہے۔ بھائی سے صاحبزادے کی لاغری کا شکوہ بھی صحیح نہیں ہو سکتا اس لیے کہ بی بی ہاجرہ کی ساری عمر درویشی کے ماحول میں گزری تھی۔ میکہ میں بھی اور سسرال میں بھی۔ پھر وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ صاحبزادے کو ابتدا ہی سے کم خوری کی عادت ہے۔ اب رہا شادی کا معاملہ تو باباصاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرما دیا تھا کہ صاحبزادے کی کیفیت شادی سے مناسبت نہیں رکھتی۔ یہ جواب بی بی

ہاجرہ کو مایوس کرنے کیلئے کافی تھا۔ مگر حقائق اور شئے ہیں اور ارمان اور شئے ہیں۔ مایوسی میں عورت عجیب اشکال پیدا کرلیا کرتی ہے۔ نہایت عاجزی اور ادب سے عرض کیا کہ کیفیات بدلی جا سکتی ہیں مگر ہماری مفلسی و غریبی نہیں بدلی جا سکتی۔ والدہ اگر حیات ہوتیں تو آپ ایسا عُذر کبھی نہ کرتے۔ تیر نشانے پر بیٹھا۔ اپنی صاحبزادی بی بی خدیجہ عرف شرف النساء کی شادی مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ سے کرنا ہی پڑی۔ یہ صاحبزادی زوجہ اول بی بی نجیب النساء کے بطن سے تھیں۔ بی بی نجیب النساء کا زوجہ اول ہونا "گلزارِ حقیقت صابری" کے مصنف کا الہام نہیں ہے بلکہ ان کے خلیفہ۔ صاحب "اسرارِ عترت فریدیؒ" کا انکشاف ہے۔ ظاہری تذکرے مخدوم رحمۃ اللہ علیہ کی شادی بی بی شریفہ سے ظاہر کرتے ہیں جو بی بی ہزبرہ خاتون کے بطن سے تھیں۔ ان ظاہری تذکروں میں یہ بھی روایت ہے کہ بی بی شریفہ کے شوہر حضرت عمر صوفی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تھے۔ بہر حال پہلے ہی دن دُلہن کے انتقال ہوجانے کا صدمہ بی بی ہاجرہ کی جان لے کر رہا۔ اور اسی سال ان کا بھی انتقال ہوگیا۔ ان کا سال وصال اصل میں ۶۳۶ھ اور ۶۳۷ھ کے وسط میں ہونا چاہیئے مگر کشفی تذکرہ میں ان کا سال وصال ۶۴۲ھ لکھا ہے۔ مخدوم پاک رحمۃُ اللہ علیہ کے منتظم لنگر ہونے کی روایت بھی شبہہ سے خالی نہیں۔ ان کا تشریف لانا بہ عمر آٹھ سال ہانسی میں ثابت ہوتا ہے اور ہانسی میں بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا لنگر کبھی ہرگز جاری نہیں ہُوا تھا۔ اجودھن کے ابتدائی قیام میں بھی لنگر خانہ کا ثبوت نہیں ملتا۔ عرصہ کے بعد جب اجودھن میں فتوحات کا دروازہ کھُلا تو لنگر خانہ بھی وجود میں آیا۔ اجودھن کے لنگر خانہ کے منتظمین میں مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کا اسم گرامی کسی تذکرہ نویس نے نہیں لکھا ہے۔ "گلزارِ حقیقت صابریؒ" کا کشفی بیان ہے کہ مخدوم علیہ الرحمۃ نے بارہ سال لنگر تقسیم کیا۔ اس مدت میں مُرشد کے تین صاحبزادوں کو نذر اجل کیا۔ پھر اپنی اہلیہ کو جلا کر خاکستر

بنا دیا۔ ان بزرگ کے خلیفہ نے اپنے تذکرہ "اسرارِ عترت فریدیؒ" میں صاف لکھا ہے کہ بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دو صاحبزادے نعیم الدّین اور فرید بخش کا انتقال فطری موت سے ہانسی میں ہوا تھا۔ اور عزیز الدّین کی موت اجودھن میں ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ صاحبزادوں کی موت کے متعلق مرشد کا کشف صحیح ہے یا ان کے خلیفہ کا۔ صابری تذکروں کو علم نہیں کہ یہ تین صاحبزادے تھے بھی یا نہیں اور کس اہلیہ سے تھے۔ گلزارِ حقیقت صابری میں ان صاحبزادوں کی والدہ کا نام درج نہیں ہے مگر اسرارِ عترت فریدی میں مرقوم ہے کہ بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی پہلی شادی بی بی نجیب النساء سے ہوئی تھی۔ یہ جملہ اولاد ان کے ہی بطن سے تھی۔ پھر یہ بھی لکھا ہے کہ بی بی نجیب النساء ہی کی وجہ سے بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ہانسی کی سکونت اختیار کی تھی۔ لہٰذا یہ خیال کہ ہانسی میں حضرت جمال رحمۃ اللہ علیہ کی وجہ سے قیام رکھا تھا بالکل فضول و غلط ہے۔ بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ان کے مرشد نے شادی کرنے کی تاکید کی تھی۔ اس کی تعمیل مرشد کے سامنے ہی ہونا چاہیئے تھی۔ لہٰذا جن بی بی صاحبہ سے مرشد کی حیات میں شادی ہوئی ان کا نام نجیب النساء تھا۔ بی بی ہزبرہ خاتون سے عقد مرشد کے وصال کے بہت بعد میں ہوا تھا۔ قیام ہانسی اور ہزبرہ خاتون کے عقد کے درمیان میں جو خلاء و وقفہ تھا وہ صاحب اسرار عترت فریدی کے کشف نے بجا طور پر پورا کردیا۔ لیکن کسی نے نہیں لکھا ہے کہ دراصل ہزبرہ خاتون کس خاندان سے تھیں اور کس کی بیٹی تھیں۔ یہ کہنا کہ وہ بلبن کی صاحبزادی تھیں۔ اس کی شہادت کسی طرح تاریخ سے نہیں ملتی [۱]

کشفی روایات سے مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کے قیام اجودھن کی مدت ۲۳ سال

---

[۱] اسکے متعلق مفصل بحث سوانح بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ میں ملاحظہ ہو۔

ہے اور واقعاتی طور پر ۶۱۴ھ سے ۶۲۶ھ تک بارہ سال کی ہے۔ مخدوم علیہ الرحمۃ کے حالات جن کو شریعت و طریقت کے معیار پر صحیح کہا جا سکتا ہے کشفی تذکروں کے بیانات سے قطعی مختلف ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ برگزیدہ ہستیوں کی پیدائش و تربیت عام بچوں سے مختلف و برتر ہوتی ہے لیکن ظاہری و کشفی تذکروں میں مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت کو قیاس و مبالغہ کی بنا پر اس طرح ظاہر کیا ہے کہ حقیقت فسانہ بن جاتی ہے اور ان کی خام خیالیاں خود ان کے خلاف شہادت دیتی ہیں۔

خُلاصہ

(۱) بی بی ہاجرہ کی شادی شیخ عبدالرحیم سے نہیں بلکہ ان کے صاحبزادے شیخ عبداللہ سے بمقام کھوتوال ۶۱۲ھ/۱۲۱۶ء میں ہوئی اور اسی سال کچھ قبل دہلی میں حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ نے خلافت مرحمت کی تھی اور ۶۱۳ھ میں مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کی پیدائش کھوتوال میں نہیں بلکہ ہرات میں ہوئی تھی۔

(۲) مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ بعمر آٹھ سال ۶۲۱ھ/۱۲۱۵ء میں بابا صاحب کی خدمت میں اجودھن میں نہیں بلکہ ہانسی میں لائے گئے تھے۔

(۳) تین برس کی ظاہری تعلیم کے بعد انہیں ۶۲۴ھ/۱۲۱۸ء سے روحانی تعلیم دی گئی۔ مجاہدات کروائے گئے۔ اس زمانہ میں بمقام ہانسی لنگر خانہ جاری نہیں ہوا تھا۔

(۴) ۶۳۴ھ/۱۲۲۸ء کے بعد بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ مع متعلقین ہانسی سے اجودھن تشریف لے گئے۔ مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ وہاں بارہ سال رہے۔

(۵) ہانسی یا اجودھن میں مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ سے شانِ جلالی کا اظہار نہیں

ہوا۔ یہاں کی جلالی داستانیں قیاسی و فرضی ہیں۔

(۶) والدہ کی وفات کی خبر سن کر بی بی ہاجرہ دوبارہ ہرات سے ۶۳۶ھ کے قرب و جوار میں اجودھن آئی تھیں۔

(۷) بھائی سے ان کی لاغری کے متعلق کچھ کہنا غلط ہے۔

(۸) مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کی شادی بی بی خدیجہ سے ہوئی جو بی بی نجیب النساء کے بطن سے تھیں۔ اہلیہ مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ناگہانی طور پر شادی کی شام کو ہو گیا۔ ان کی موت کی وجہ جلالِ صابری نہیں ہے۔

(۹) لنگر خانہ کا اجراء ہانسی میں نہیں بلکہ اجودھن میں ہوا اور وہاں کے منتظمین میں مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا نام نہیں ہے۔

(۱۰) بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے تین صاحبزادوں کا انتقال فطری موت سے ہوا نہ کہ جلالِ صابری سے۔

(۱۱) حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قیام بمقام ہانسی اہلیہ اولیٰ بی بی نجیب النساء کی وجہ سے رہا۔ نہ کہ حضرت جمال رحمۃ اللہ علیہ کی وجہ سے۔

(۱۲) حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ کا وصال ۶۳۶ھ کے آخر میں ہوا یا ابتداء ۶۳۷ھ میں۔

(۱۳) بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اہلیہ ثانی بی بی ہزیرہ خاتون سلطان بلبن کی صاحبزادی نہیں تھیں۔ اس کے متعلق تاریخی شہادت نہیں ملتی۔



خلافت

عمرہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

شہرت تو یہی ہے کہ حضرت مخدوم علی احمد صابر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پیدائشی مجذوب تھے اور ان کا شمار بابا فرید الدین مسعود گنج شکر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے خلفائے اعظم میں ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ مجاذیب مستحق خلافت نہیں ہوا کرتے۔ حضرت چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ "شیخی کے لائق سالک کامل۔ سالک مجذوب اور مجذوب سالک ہوتے ہیں۔ مجذوب نہیں ہوا کرتے۔" خلافت کا منشاء و مقصد سلسلہ کی تبلیغ و اشاعت ہے اور یہ کام ظاہری طور پر مجاذیب سے ممکن نہیں۔ راہ سلوک میں مبتدی کو پہلی منزل میں محض سالک کا خطاب دیا جاتا ہے۔ دوسری منزل میں وہ سالک مجذوب کہلاتا ہے اور تیسرے درجہ میں وہ قطعی مجذوب بن جاتا ہے اور بدحواس ہونے کی وجہ سے حد شرع سے بھی مستثنیٰ خیال کیا جاتا ہے۔ اس درجہ سے ترقی کر کے وہ سلوک کی طرف مائل ہوتا ہے اس لیے مجذوب سالک سے نامزد ہوتا ہے۔ اس درجہ میں اس کی کیفیت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ رُخ میری طرف نظر کہیں اور۔ اس کے بعد پانچویں منزل میں سالک کامل ہو جاتا ہے۔ حضرت مخدوم علیہ الرحمۃ کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مجذوب سالک تھے اور اسی چوتھے درجہ میں انہیں خلافت مرحمت کی گئی تھی۔

دیکھنا یہ ہے کہ بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنے خلفاء کو کس طرح کامل و اکمل بناتے تھے۔ ان کے خلیفہ اول حضرت جمال ہانسوی رحمۃ اللہ علیہ علم و فضیلت کی سندیں رکھتے تھے اور خطیب کے عہدہ پر فائز تھے[1]۔ سب سے پہلے فضیلت کی نفی کرا کر ان سے عہدۂ خطابت سے استعفیٰ دلوایا۔ پھر سالک مجذوب کے درجہ میں لائے گئے۔ اس درجہ کو طے کر کے وہ قطعی مجذوب بن گئے۔ چنانچہ مجذوبیت ہی کی وجہ سے مرشد کی شادی میں شریک نہ ہو سکے جو ہزبرہ خاتون سے ہوئی تھی[2]۔ اس کے بعد ان کا داخلہ مجذوب سالک کی منزل میں ہوا۔ بعدہٗ سالک کامل بن گئے۔ گویا ترتیب وار جملہ مراتب طے کروا کر خلافت ان کو عطا کی گئی اور بجائے خطیب کے قطب مشہور ہوئے۔ ان کے بھانجے منتخب الدین کو بھی یہی تمام منازل طے کروا کر خلافت عطا فرمائی تھی۔ ان دونوں بزرگوں کو خلفائے بابا صاحب رحمۃ اللہ

---

[1] شہاب الدین غوری نے ہانسی فتح کر کے حضرت جمال کے والد حمید الدین کو وہاں کا قاضی مقرر کیا۔ حضرت جمال ۵۹۳ھ یا ۵۸۶ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کی زوجہ اول کے بطن سے شاہ حامد تولد ہوئے جو بقول سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ مجذوب مطلق تھے۔ زوجہ ثانی سے صوفی برہان الدین تھے۔ جن کا سال پیدائش ۵۵۹ھ ہے۔ اسی سال حضرت جمال رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہوا تھا۔ حضرت جمال رحمۃ اللہ علیہ نے اجودھن میں سات مرتبہ حاضری دی تھی۔ عطیہ خلافت کے ساتھ ان کو خرقہ، عصا، چوبی نعلین اور نسخہ عوارف المعارف بھی دیا گیا تھا۔ ان کے صرف دو مرید تھے مولانا حسام الدین اندربیتی اور میران صاحب تعلقہ دار اگروہا ضلع حصار ان کی ساتویں حاضری پر سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ دوسری مرتبہ تشریف لے گئے تھے۔ اور وہیں اجودھن میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ حضرت جمال خلافت کسی کو نہ دے پائے یعنی ان سے سلسلہ نہیں چلا حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالیٰ کی عمر ۷۳ سال کی ہونا چاہیئے۔

[2] منقول از حقیقت گلزار صابری۔

علیہ میں تقدم واوّلیت حاصل ہے۔ ۶۴۶ھ میں مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ خلافت سے نوازے گئے تھے مگر ان کے حالات سے کسی طرح پتہ نہیں چلتا کہ ان سے سلوک کا درجہ طے کروایا تھا۔ سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کو خلافت سے سرفراز فرمایا مگر ان کے واردات سے ظاہر نہیں ہوتا کہ اُن سے مجذوبیت کا درجہ طے کروایا تھا۔

اجودھن میں مستقل قیام ہو جانے پر مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کے لیے ایک حجرہ مخصوص کر دیا گیا تھا اور وہ حجرہ آج تک ان کے مشاغل اور وجود کی گواہی دے رہا ہے اور صابری حجرے کے نام سے موسوم و مشہور ہے۔ حضرت امام علی سیالکوٹی جب بیعت کیلئے آئے تو ارشاد ہوا کہ "این علی بہ آن دو علی لاحق باشد و شغل یک جا کنند"۔ جن دو علی کے متعلق ارشاد فرمایا گیا وہ علی احمد صابر اور علی بہاری تھے۔ اس حجرے کے مشاغل کے بعد مجذوب سالک کے درجہ میں مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو خلافت دی گئی تھی۔ منکرین بر طرف مخالفین کو بھی مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کی خلافت تسلیم ہے۔ لیکن مخالفین کا کہنا یہ ہے کہ مخدوم رحمۃ اللہ علیہ سے سلسلہ نہیں چلا اور جو سلسلہ ان سے منسوب کیا جاتا ہے وہ دراصل شمسی سلسلہ ہے۔ حضرت شمس الدین پانی پتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے تنہا و واحد خلیفہ تھے۔ انہوں نے نہ کبھی اس سلسلہ کے شمسی ہونے کا دعویٰ کیا اور نہ ان کے متبعین نے کسی طرح ایسا اعلان کیا لہٰذا معاندین کا مغالطہ بے معنی ہے۔

حضرت باباصاحب رحمۃ اللہ علیہ کا دستور تھا کہ اپنے خلفاء کو دوسرے سلسلوں کے بزرگوں کی خدمت میں بھیجا کرتے تھے تاکہ تعارف ہو جائے اور ایک دوسرے کے اصولوں کو سمجھ سکیں۔ لیکن تفصیل نہیں بتائی ہے کہ کس خلیفہ کو کس بزرگ کے پاس بھیجا۔ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت جمال۔ حضرت مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

حضرت سلطان المشائخ کو کسی بزرگ کے پاس نہیں بھیجا تھا۔ ان حضرات کی شہرت و مقبولیت کی وجہ سے دوسرے سلسلہ والے خود واقف و معترف ہوتے۔ حضرت جمال کے متعلق یہ روایت موجود ہے کہ ان پر حضرت بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فریفتہ تھے اور انہوں نے بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے فرمائش کی تھی کہ میرے سب مرید لے لیجئے اور جمال کو مجھے دے دیجئے۔ انہوں نے جواب دیا کہ تبادلہ جمال میں نہیں ہو سکتا۔ اس روایت کو لطیفہ ہی سمجھا جائے ورنہ یہ روایت بے اصل معلوم ہوتی ہے۔

مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی خلافت کے متعلق کشفی تذکرہ گلزارِ حقیقت صابری میں بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی روحانی کتاب سرّ العبودیت سے جو لکھا گیا ہے وہ لطف سے خالی نہیں۔ لکھا ہے کہ بہ حکم باطن ۶۲۲ھ میں مخدوم صابر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو میں نے حجرے سے نکالا اور کاملین کی مجلس میں بیعت توبہ اور حوالت خاندان چشتیہ میں مشرف کر کے انہیں کیفیت باطن، مرتبہ سلوک کی تعلیم سے مستفیض کیا۔ اب وہ رات کو اپنے حجرے میں مستغرق رہتے تھے۔ اور دن کو میرے پاس رہ کر اسرار کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ستائیس برس تعلیم لسانی میری سے مراتبات شہنشاہی ولایت کیفیت باطن کی تحصیل کرتے رہے۔ ۶۵۰ھ میں بہ حکم حضرت بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ رویا میں مخدوم علی احمد صابر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو میں نے اپنے ہمراہ لیا۔ ہم دونوں حضرت شیخ کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ عالم ملکوت سے عالم جبروت کی طرف عروج ہوا۔ وہاں تمام حضرات چشتیہ اور جمیع سلاسل کے اولین و آخرین بزرگ محفل نبوی میں موجود تھے میرے پیر و مرشد قبلہ نے ہم دونوں کو تخت مبارک کے روبرو کھڑا کیا۔ پھر بموجب ارشاد شیخ میں مخدوم علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ کو حضور نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قریب لے گیا۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ

وسلم نے مخدوم علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ کی پشت پر سیدھے شانہ کی طرف بوسہ دیا۔ اور زبان مبارک سے ارشاد فرمایا "ہذا ولی اللہ" پھر تمام حاضرین نے اسی طرح اسی جگہ بوسہ دیا اور وہی الفاظ "ہذا ولی اللہ" کہے۔ اتنے میں آنکھ کھلی تو لیلۃ القدر کی کیفیت کے آثار کا عروج ہو رہا تھا۔ بیدار ہو کر میں "علی احمد صابر" رحمۃ اللہ علیہ کے حجرے کی طرف گیا۔ دیکھا کہ خلاف معمول دروازہ کھلا ہوا ہے وہ مرتبہ فنا میں مستغرق ہیں اور تمام رجال الغیب۔ نقیب وتد اور قطب ان کی پشت پر بوسہ دیتے ہیں اور "ہذا ولی اللہ" کہتے ہیں۔ صبح کو جملہ بزرگ مجھے مبارکباد دینے آئے پھر ان میں سے کچھ چلے گئے اور کچھ ٹھہر گئے (ان سب کی لمبی چوڑی فہرست نام بنام مع ہر ایک کی روحانی کتاب کے درج ہے) جب تمام حاضرین فیضیاب ہو چکے تو میں نے علی احمد صابر کو اپنے پاس بٹھا کر بیعت امامت اور ارشادِ خاندانِ چشتیہ عالیہ سے اپنے ہاتھ پر مشرف فرمایا۔ پھر اپنے ہاتھ سے کلاہ اوڑھائی اور عمامہ استر باندھ کر مثلِ خلافت بہ مضمون ولایت کلیر اقلیم ہند سے اور سب حاضرین کو سنا کر خطاب۔ خطاب باطنی "قطبِ عالم غیاث الہند الاجلال" شاہ مخدوم علی احمد صابر سے اولیاء ہمعصر کو مطلع کیا۔ اور اسم ظاہری مثال خلافت میں بہ القاب "بادشاہ دوجہاں مخدوم علاء الدین علی احمد صابر ختم الارواح سلطان اولیا" کے تحریر کیا۔ اس وقت بے اختیار میری زبان سے نکلا "علم ظاہری و باطنی میرا علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ لے چلا اور علم باطن بھی بالکل اسے دیدیا" پھر سات سیر شہد خالص کا شربت فاتحہ ہو کر تقسیم ہوا۔ بعد فاتحہ خوانوں نے راگ شروع کیا تھا کہ طبیعت بادشاہ دوجہان مخدوم علاء الدین علی احمد صابر ختم الارواح سلطان اولیاء پر غلبۂ حال کا جلوہ ہونے لگا۔ مصلحتاً اس راگ کو موقوف کیا۔ پھر شب کی مجلس میں سنایا گیا" (اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ خلافت ۶۵۰ھ میں دی تھی۔ سر العبودیت میں باباصاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ۶۵۴ھ میں

بروز پنجشنبہ بعد نماز چاشت کے سیّد نظام الدین بدایونی دہلی سے تقریباً چودہ برس کی عمر میں میرے پاس اجودھن آئے اور پانچ روز کے بعد بتاریخ ستائیس ماہ مذکور سنہ صدر روز دوشنبہ بعد نماز مغرب کے میں نے اپنے ہاتھ پر بیعت توبہ سے خاندانِ چشتیہ عالیہ میں مشرف کر کے تعلیم طریقت سے مستفید کیا۔ سیّد نظام الدین دس روز بعد حصول بیعت کے میرے پاس قیام کر کے دہلی کو روانہ ہو گئے۔ ایک سال بعد پھر حاضر ہو کر تعلیمِ کیفیت باطن میں بہ دل و جان متوجہ ہوئے۔ پھر یہ بھی لکھا ہے کہ ۶۴۶ھ ۱۵ ماہ ذوالحجہ کو روز دوشنبہ بعد نماز فجر کے عطیہ خلافت کے بعد حضرت مخدوم پاک کو کلیر روانہ کیا گیا تھا۔ حضرت سلطان المشائخ کی روحانی کتاب مقناطیس الوحدت میں بھی مخدوم پاک کے کلیر جانے کی یہی تاریخ درج ہے"۔

سیر الاولیاء میں ایک نئی اور عجیب روایت ہے کہ حضرت جمال رحمۃ اللہ علیہ کو خلافت ناموں پر مہر لگانے یا خلفاء کا رجسٹر رکھنے کے ساتھ خلافت ناموں کے رد و قبول کا بھی اختیار دیا تھا۔ یہ آئین طریقت کے قطعی خلاف ہے۔ اگر اس حق دہی کو باباصاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا اجتہاد سمجھا جائے تو اس کے جواز کی کہیں سے سند نہیں ملتی۔ اسی اختیار کی بناء پر سیر الاولیاء میں ایک بے سروپا روایت اور بھی ہے۔ اس مجہول روایت میں اس خاص مرید کا نام نہیں ہے۔ اس بے نام ونشان مرید نے باباصاحب رحمۃ اللہ علیہ سے خلافت کی درخواست کی تھی۔ قبول نہ کئے جانے پر اس مرید نے کہا میں ایسی سند خود بنا لوں گا۔ اور اپنا کام چلاؤں گا۔ اس کو سن کر۔ دروغ بہ گردن راوی۔ باباصاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت بدرالدین اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کو ہدایت فرمائی کہ آئندہ سے اپنی کتابت کے دستخط خلافت ناموں پر کیا کریں تاکہ ہیچ عریضے را دریں کار مداخلت نہ باشد۔ آنکھوں میں خاک ڈال کر لکھا ہے کہ یہ شخص اپنی مصنوعی سند لے کر حضرت جمال رحمۃ اللہ علیہ سے تصدیق کرانے پہنچا۔ انہوں نے دیکھتے ہی فرمایا کہ تو خلافت

کے لائق نہیں ہے اور اس کی جعلی سند چاک کر دی۔ اب لطف یہ ہے کہ یہ مکار حضرت جمال رحمۃ اللہ علیہ کی شکایت کرنے کے لیے حضور بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں آیا کہ میری سند چاک کر دی۔ حضرت نے جواب دیا کہ جمال کے پھاڑے ہوئے کو ہم جوڑ نہیں سکتے۔ ایسے شخص کو ایسا ہی جواب ملنا چاہیئے تھا۔ اس تجاہل عارفانہ کو سن کہ نام نہاد جمالی فخر و مباہات کرنے لگے اور آنکھوں سے معذور عقیدت مندوں نے بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مجبوری کو تسلیم کر لیا۔

اب طُرفہ تماشہ یہ ہے کہ یہی ناقابل قیاس روایت حضرت مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب کر دی گئی ہے۔ اس روایت میں حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالیٰ عنہ نے مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے یہی نہیں فرمایا کہ آپ خلافت کے لائق نہیں ہیں بلکہ یہ بھی کہا کہ آپ کی تعیناتی بھی دہلی میں غلط ہوئی ہے۔ دہلی آپ کے جلال کو برداشت نہیں کر سکے گی۔ یہ سنتے ہی مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کو جلال آ گیا اور کہا کہ میں نے آپکا سلسلہ منقطع کر دیا۔ حضرت جمال سہم گئے اور دریافت کیا کہ میرا کس طرف سے منقطع کیا۔ جواب دیا کہ آپ کا سلسلہ چلا ہی کب تھا۔ لہٰذا اوپر سے منقطع کیا ہے یعنی بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت ختم کر دی۔ ابھی تک سندِ خلافت کا ذکر تھا۔ یہ دہلی کی تعیناتی کا پروانہ کدھر سے نکل آیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے سندِ خلافت چاک کی یا پروانہ چاک کیا یا دونوں کو پھاڑ ڈالا۔ مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں سے جا کر بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ سے ماجرا بیان کیا تو انہوں نے ارشاد فرمایا: تبر مردان خطا نمی شود یعنی حضرت جمال کی نسبت ختم ہو گئی۔ اس کے بعد فرمایا تم غم نہ کرو۔ اب ہم اپنے ہاتھ سے لکھ کر تمہیں کلیر کا پروانہ دیں گے۔ اس سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے پروانہ دہلی چاک کیا تھا اور سند خلافت چاک ہونے سے بچ گئی تھی۔ عقل سلیم اس نزاع ہانسی کے کسی جزو کو کسی بھاؤ تسلیم نہیں کر سکتی۔ میر خورد کو یہ علم یقینی تھا کہ مخدوم

رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ بمقام ہانسی بچپن میں لائے گئے تھے اس وقت حضرت جمال رحمۃ اللہ علیہ جوان تھے۔ لہٰذا یہ ممکن نہیں کہ انہوں نے مرشد کے بھانجے کی دیکھ بھال نہ کی ہو۔ اس لیے بزرگی و خوردی کے آداب کے مدِنظر اس قسم کا نزاع ممکن الوقوع نہیں مانا جا سکتا اس نزاع اور جمال کے رد و قبول کے اختیار کے متعلق خود سیر الاولیاء کی دوسری روائتوں سے تردید ہو جاتی ہے جو اہل نظر سے مخفی نہیں۔

سیر الاولیاء میں ایک روایت اپنے والد سے سُن کر نقل کی گئی ہے کہ علی صابر رحمۃ اللہ علیہ درویشے بود۔ قدم ثابت و نفس گیرا داشت۔ ساکن ڈیکری بودے پیوند بخدمت شیخ الشیوخ عالم داشت و اور از شیخ الشیوخ عالم اجازت بیعت بود۔ پھر بھی لکھا ہے کہ سند دیتے وقت یہ بھی فرمایا تھا بھوگا خواہی شد۔ یعنی بے عیشے خواہد گشت۔ اس کے علاوہ یہ ہدایت نہیں کی تھی کہ سند کی تصدیق حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ سے کرا لینا۔ اسی طرح یُوسُف ہانسوی کے متعلق بھی ہے کہ ان سے بھی حضرت جمال سے تصدیق سند کے لیے نہیں کہا تھا البتہ حضرت سلطان المشائخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو رخصت کرتے وقت فرمایا تھا کہ ہانسی میں جمال رحمۃ اللہ علیہ کو اور دہلی میں حضرت منتخب الدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو اپنی سند دکھا لینا۔ اس دکھانے میں حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ عقل حیران ہے کہ بھوگا والی دُعا مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پر کیسے اور کیوں منطبق کر دی گئی ہے۔ بھوگا ویدانت کی اصطلاح ہے اس کے معنی خوش باشی کے ہیں۔ صاحب گلزار ابرار نے اس بنا پر مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کی خوش باشی کی توجیہ یُوں کی ہے کہ مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ پر حیرت طاری رہتی تھی اور حیرت خوش باشی کی علامت ہے۔ اگر بھوگا کی صحیح حقیقت سمجھی جائے تو اس کا تعلق تناسخ سے ہے۔ تناسخ میں دو لفظ بھوگ اور بھاگ خاص معنی رکھتے ہیں۔ ویدانتی کرم اور جنم کے قائل ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ ہر شخص اپنے کرم و عمل کے مطابق جنم لیا کرتا ہے اور یہ سلسلہ لامتناہی ہے کرموں کے متعلق جنم لینے کو بھاگ

کہتے ہیں اور بھوگ کو بلا شرط کے عطیۂ غیبی خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن موجودہ ترقی یافتہ ویدانتی بھوگ کو بھی بھاگ کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ مثلاً سری کرشن مہاراج متھرا میں دیوکی اور نندلال کے گھر تولد ہوئے مگر غیب سے ہدایت ہوئی کہ ان کو بندرابن جودا کے یہاں پہنچا دیا جائے اور اس کی نوزائیدہ بچی کو متھرا لے آیا جائے۔ گویا یہ تبادلہ بھاگ نہ تھا بلکہ بھوگ تھا۔ راجہ کنس نے پیدائش کی خبر سُن کر اس بچی کو مار ڈالنا چاہا مگر وہ ان کے ہاتھ سے چھُوٹ کر یہ کہتی ہوئی آسمان پر چلی گئی کہ تیرا مارنے والا پیدا ہو چکا ہے۔ چنانچہ سری کرشن مہاراج نے کوروں اور پانڈوں میں جنگ کروا کر راجہ کنس کا نام و نشان میٹ دیا۔ اور اس کے جبر و ظلم سے مخلوق کو بچا لیا۔ یہ ویدانتی مسئلہ وحدت الوجود کو تناسخ سے ہی تعبیر کرنے لگے ہیں مگر دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ غور فرمایا جائے کہ بابا صاحب علیہ الرحمۃ نے علی صابر رحمۃ اللہ علیہ ساکن ڈبکری کو بھوگ کی دعا دی بھی تھی یا نہیں۔ پھر تذکرہ نویسوں کی یہ بڑی غلطی ہے کہ اس دعا کو علی صابر ساکن ڈبکری کے بجائے حضرت علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ سے محیر العقول طریقہ سے منسوب کر دیا۔

حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا دستور تھا کہ اپنے خلفاء کو کسی نہ کسی خدمت پر متعین کر دیا کرتے تھے۔ مثلاً بدرالدین اسحاق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو اسناد، تعویذ اور خطوط لکھنے پر مامور کیا تھا۔ بعض کو لنگر کا منتظم بنایا تھا۔ اخی مبارک حاضر دربار ہوتے تھے شیخ عیسیٰ کو نیچی خدمات دی تھیں۔ خواجہ شیبانی وضو اور غسل کرواتے تھے اور کپڑے دھوتے تھے حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے متعلق مذکور ہے کہ جب اجودھن آتے تو لنگر کے لیے جنگل سے لکڑیاں لاتے تھے۔ ان کے متعلق رجسٹر رکھنے اور مُہر لگانے کی خدمت کا حال سوائے سیر الاولیاء کے اور کہیں مسطور نہیں ہے۔ ہانسی کا نزاع محض سیر الاولیاء کی ایجاد ہے اور الحاقی ہے۔ کشفی تذکرہ اسرار عزت فریدی کے صفحہ ۱۸۶ پر ندامت و افسوس کے

ساتھ تحریر ہے کہ اس نزاع کا حال مصنف نے بھی اپنی کتاب گلزار فریدی میں لکھا تھا۔ یہ کتاب ۱۳۰۲ھ میں لکھی تھی۔ اس پر درگاہ فریدیہ سے مثال میں مجھ پر عتاب ہوا . . . . پھر بعد میں جناب بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور مخدوم صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی نوازش سے پُورے حالات معلوم ہوئے اور خاص خلافت نامہ مخدوم پاک کی بھی زیارت نصیب ہُوئی۔ برادرانِ وطن کی خدمت میں عرض پرداز ہوں کہ ان تہمت ناک باتوں سے پرہیز کرنی لازم ہے . . . . عالم مثال میں مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا خلافت نامہ مجھے دکھایا گیا تھا۔ اس پر پیشین و حال کے جملہ اولیاء کرام کی گواہی کے دستخطوں کے ساتھ حضرت جمال کی بھی گواہی کے دستخط موجود ہیں۔

مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کو خلافت ۶۴۶ھ میں مرحمت فرمائی گئی تھی اور اسی سال دربار الٰہی سے کلیر کی ولایت عطاء کی گئی تھی۔ اور وہ فوراً کلیر کو روانہ ہو گئے تھے۔ مجذوب سالک ظاہر سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ ان کا قیام اگر بستی میں ہوتا ہے تو اجنبی کی طرح رہتے ہیں۔ سارا وقت جنگل میں گزارتے ہیں۔ مخدوم پاک کو دہلی کی ولایت کا دیا جانا اور اس کا منسوخ ہو جانا محض فریب ہے۔ کلیر کی تعیناتی کا ایک سبب یہ بھی قیاس کیا جاتا ہے کہ حضور غریب نواز قدس سرہ کے زمانہ میں کلیر کے والی امام الدین دمشقی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ یہ حضرت حضور غوث پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی اولاد سے تھے۔ ان کا تقرر ۵۸۹ میں ہوا تھا اور اسی سال جنگِ کلیر میں شہید ہو گئے۔ معلوم نہیں ان کے بعد ستاو ۵۷ برس وہاں کا صاحب ولایت کون رہا۔ اب ۶۴۶ھ میں یہاں کی ولایت مخدوم پاک رحم علیہ کو دی گئی چونکہ یہ غوث پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد سے تھے لہٰذا۔

حق بہ حقدار رسید

خُلاصہ

(۱) مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سالک مجذوب تھے۔

(۲) ان کو خلافت و ولایت ۶۴۶ھ میں ملی تھی نہ کہ ۶۵۰ھ میں۔

(۳) ان کا تقرر دہلی میں کہیں نہیں ہوا۔

(۴) خلافت و ولایت کے فرائض علیحدہ ہوتے ہیں۔

(۵) نزاع ہانسی کے متعلق سیر الاولیاء کی روائتیں الحاقی ہیں۔ میر خورد ایسی فضول روایت نہیں لکھ سکتے تھے۔

(۶) حضرت سلطان المشائخ بیعت کے لیے اجودھن ۶۵۲ھ میں گئے تھے مخدوم اس سے پہلے کلیر جا چکے تھے۔ دونوں کی ظاہری ملاقات نہیں ہوئی۔

(۷) حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا سلسلہ نہیں چلا۔ ان کی اولاد سلسلہ نظامیہ میں مدغم ہو گئی۔ اب جو ان کا سلسلہ چلانا چاہتے ہیں یہ محض دھاندلی ہے۔ ان حضرات نے مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پر جو اعتراض کیئے ہیں ان میں نام کو بھی روحانیت نہیں ہے۔

(۸) بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے کسی خلیفہ کی سند پر حضرت جمال کی مُہر نہیں ہے۔ اور یہ سب سندیں حضرت بدرالدین اسحاق رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کی لکھی ہوئی ہیں۔

ولایت

این شربت عاشقیست خسروؔ
بے خونِ جگر چشید نتواں

حضرت مخدوم علاء الدین علی احمد صابر قدس سرہٗ العزیز کو بیعت کے بائیس برس بعد بہ عمر ۲۳ سال ۶۴۶ھ میں خلافت ملی اور اُسی سال براہِ راست کلیر کی ولایت پر مامور کر دیئے گئے۔ انہوں نے اپنے وصال تک ولایتِ کلیر کا انتظام کیا اور سلسلہ کی تبلیغ فرمائی۔ اقتباس الانوار میں ہے کہ "کلیر پہنچتے ہی عبادت اور فیض رسانی میں مصروف ہو گئے اور بعد وصال بھی فیض اُسی طرح جاری رہا جس طرح حیات میں تھا۔" اہلِ ہنود کی روایات کے مطابق کشفی تذکرے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت نبوی (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم) سے قبل ۲۸۲ع میں دہلی کے راجہ کرم پال نے اس نواح میں ایک شہر بسایا تھا۔ جس کا نام "ہردوار گڑھی پک" رکھا تھا۔ یعنی خدا کی گڑھی کا راستہ۔ اس راجہ کے لڑکے بکرم پال نے وہاں عالیشان مندر بنا کر سونے چاندی کی مورتیں نصب کیں اور نگرانی کیلئے مہنتوں کی گدی قائم کی۔ (یہ کمیٹی ہردوار میں ابھی تک باقی و جاری ہے) عرصہ کے بعد اس شہر کی حفاظت کے لیے جنوب میں کچھ فاصلہ پر بکرم پال کے صاحبزادے راجہ کرم پال نے یہاں قلعہ تعمیر کیا تھا اور کلیر کے نام سے موسوم کیا۔ صحیح طور پر نہیں معلوم کہ مسلمانوں نے اس قلعہ کو کب فتح کیا تھا۔ بستان

صابری " کے مصنف ماسٹر امراؤ حسن قادری صابری کی رائے ہے کہ بنگال جاتے ہوئے بختیار خلجی نے ۵۹۷ھ/۱۲۰۱ء میں فتح کیا تھا۔ مگر اس کی تردید تاریخ کے علاوہ اس روایت سے بھی ہو جاتی ہے کہ حضور غریب نواز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے امام علی دمشقی کو کلیر کا والی بنا کر ۵۷۹ھ میں بھیجا تھا۔ اسی سال مسلمانوں نے کلیر پر حملہ کیا تھا اور امام علی دمشقی کی اسی جنگ میں شہادت ہوئی تھی مگر مذکور نہیں ہے کہ فتح بھی ہوئی تھی یا نہیں۔ تاریخ کے حوالے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۵۸۸ھ/۱۱۹۲ء میں میرٹھ اور کوئل کی تسخیر کرنے کے بعد ۵۸۹ھ/۱۱۹۳ء میں قطب الدین ایبک نے دہلی کو دار السلطنت بنایا تھا۔ اس سال وہ اس کے انتظام و انصرام میں مشغول رہا اور کسی طرف فوج کشی نہیں کی۔ محمد غوری نے ۵۹۰ھ/۱۱۹۴ء میں راجہ جے چند کو شکست دے کر قنوج و بنارس کو فتح کیا تھا۔ اس لیے قیاس ہے کہ فتح قنوج سے پہلے محمد غوری نے ۵۸۹ھ کے آخر میں کلیر کی تسخیر کی تھی۔ بختیار خلجی والی روایت یوں بھی غلط ہے کہ وہ ۵۹۳ھ میں بہار و بنگال کی طرف حملہ آور ہوا تھا۔

ظاہر ہے کہ کلیر شریف قلعہ تھا۔ ہردوار کے خلوت نشین جاتری ممکن ہے کہ قلعہ کے ارد گرد قیام کرنے لگے ہوں اور رشیوں اور منیوں نے بھی استھان بنا لیے ہوں۔ یہاں مسلمانوں کی آبادی ہنود سے زیادہ نہیں ہو سکتی کشفی روایت ہے کہ یہاں مسلمان کثرت سے آباد تھے اور یہاں بہت بڑی مسجد بھی تھی جس میں سونے چاندی کے ظروف غسل و وضو کے لیے تھے۔ تذکرہ جات صابری میں مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کی عبادت کے لیے لکھا ہے۔ ہمہ وقت مستغرق رہتے تھے اور مسجد میں نماز پڑھنے جایا کرتے تھے۔ کلیر میں اُن کرامات اور فیض رسانیوں کی تفصیل بتائی گئی ہے کہ حاکم شہر مسمی دموان کی بکری گم ہو گئی تھی تو استفسار کرنے پر حضرت کی توجہ سے بکری کے گوشت کی ہر ہر بوٹی نے باآواز بلند بتایا کہ میں فلاں فلاں شخص کے پیٹ میں ہوں۔ دموان معتقد ہو جاتا مگر قاضی

شہر مسمی تبرک نے سمجھا دیا کہ یہ عجب طلسم ہے۔ یہ بھی لکھا گیا ہے کہ جمعہ کی نماز کے لیے عوام کے علاوہ پانچسو پالکی سوار علماء و امراء مسجد میں جمع ہوتے تھے۔ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سب سے پہلے صفِ اول میں بیٹھ جاتے تھے اور اپنی ولایت و امامت کا وعظ فرمایا کرتے تھے۔ یہ بات امراء و علماء کو ناگوار تھی لہٰذا ایک جمعہ کو انہیں صفِ اول سے اٹھا کر باہر کی آخری صف میں دھکیل دیا۔ اس پر حضرت نے مسجد کو حکم دیا کہ تو بھی سجدہ کر۔ مسجد کے سجدہ کرتے ہی جملہ نمازی دب کر مر گئے۔ اس کے بعد مزید فیض یہ پہنچایا کہ طاعون کی وبا مسلط کر دی۔ اور چھ سال کے استغراق کے بعد کلیر کے گرد بارہ بارہ کوس تک آگ لگا دی۔ یہ جملہ فیوض و کرامات گویا باطل پرستوں کو راہِ راست پر لانے کے لیے گئے تھے۔ مگر تہی دستانِ قسمت را چہ سود از مرشدِ کامل۔ جب سب کچھ بھسم ہو گیا تو سوختہ زمین میں خود ہی تن تنہا بقیہ عمر گزاری۔ البتہ کچھ ہمسایہ رہ گئے تھے اور عرصہ کے بعد حضرت شمس الدین ترک پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ آ گئے تھے۔ اب وہ فیض بھی منجملہ نوادر ہے جو بعد وصال جاری ہوا کہتے ہیں کہ مزار پر برق جلال تڑپنے لگی جس کی وجہ سے کوئی قریب نہیں آ سکتا تھا۔ مجاور بھی جان بچا کر دُور جا بسے تھے۔ گویا یہ برق دورباش کا مظاہرہ یُوں کرتی تھی کہ کسی کو جلال سے نقصان نہ پہنچے۔ لیکن شیر اور درندوں کو اجازت تھی کہ اپنی دُموں سے مزار پر جھاڑو دیا کریں۔ اتفاقیہ اس برق جلال نے ایک سنیاسی کو مزار پر حاضری کی اجازت دے دی تھی۔ اس نے قبر کے اندر کا حال معلوم کرنے کے لیے مزار میں ایک سوراخ کیا اور اس کے اندر سر ڈال کر دیکھنا چاہا۔ مگر اس کا سر پھنس کر رہ گیا اور اس کا دم نکل گیا۔ رات کو خواب میں مجاوروں کو حکم دیا کہ اس کُتے کو نکال کر باہر پھینک دیں۔ چنانچہ تعمیل کی گئی اور مزار کی مرمت بھی کر دی اب برق جلال اور شیروں کی نگرانی کو ناکافی سمجھ کر مجاوروں کو یہاں رہنے کے لیے بلا لیا گیا۔

مشہور ہے کہ مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ بے طرح جلالی تھے۔ ان کے جلال کے نقشے مختلف آتشین رنگوں میں کھینچے گئے ہیں۔ ایسے کہ ان کے تصور سے کلیجہ مُنہ کو آجاتا ہے اور دل دہل جاتے ہیں۔ ان کی جلالی داستانوں کے بیان کرنیوالے معاندین نہیں بلکہ صاحبِ علم و فضل تذکرہ نگار ہیں۔ اقتباس الانوار کے مصنف قطبِ وقت مولانا اکرام اللہ شاہ براسوی نے تحریر فرمایا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام صاحبِ جلال تھے۔ ان ہی کے نقشِ قدم پر حضرت مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تھے۔ اسی وجہ سے ان میں جلالی شان پیدا ہوگئی تھی۔ لیکن اصل یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی شریعت قہر و جلال کی تھی۔ ان کی شبیہہ مُبارک سے رعب ٹپکتا تھا مگر ان کی پوری زندگی عجز و صبر سے بھری ہوئی ہے۔ فرعون کی دشمنی اور قوم کی نافرمانیوں و گستاخیوں پر انہوں نے جلال کا اظہار کبھی نہیں کیا۔ قبطی و اسرائیلی میں بیچ بچاؤ کرتے ہُوئے قبطی کے تھپڑ مار دیا تھا اور اتفاق سے وہ مرگیا۔ اس پر انہیں بیحد ندامت ہُوئی اور سزا سے بچنے کے لیے مدائن چلے گئے۔ دوسرا واقعہ یہ ہُوا کہ چلّہ پُورا کرکے جب توریت کے الواح کوہِ طور سے لے کر آئے تو پوری قوم سامری کے بچھڑے کی پرستش کرنے لگی تھی۔ یہ صدمہ کی بات ہی تھی اپنے بڑے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام پر برس پڑے کہ تم نے قوم کو گمراہ کیسے ہونے دیا اور کیوں نہیں ہدایت کی۔ لیکن ان سے حقیقت معلوم کرنے کے بعد غصّہ جاتا رہا اور سامری سے نہایت نرمی کے ساتھ اس کی شیطنت کی وجہ دریافت کی۔ یہ دونوں واقعات موسیٰ علیہ السلام کے جلالی ہونے کا ثبوت نہیں ہو سکتے۔ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو عرصہ تک کھانا نہ کھانے کی وجہ سے صابر کا خطاب عطا ہوا تھا۔ مگر جب کلیر آئے تو وہاں کی نافرمانیوں کی وجہ سے ان کے جلال کا ذکر کیا گیا ہے۔ اہلِ عقیدت براہ کرم غور فرمائیں کہ صبر و جلال یکجا جمع ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ اگر نہیں جمع ہو سکتے تو یہ کرامتیں جو جلالی لکھی گئی ہیں مخدوم پاک رحمۃ اللہ

علیہ کی توہین ہیں۔ کلیر میں اگر غضب نازل ہوا تو وہ منجانب اللہ تھا۔ مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کا اس جلال سے کوئی تعلق نہیں۔ اندریں حالات حضرت موسیٰ علیہ السلام اور مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کو جلال سے متصف و متہم کرنے والے جلال کے معنی ہی نہیں سمجھے۔ جلال کے اقسام ہوتے ہیں۔ ایک جاہلانہ جلال ہوتا ہے اور ایک مہذب و باشعور ہوتا ہے۔ باشعور اور مہذب جلال میں محض رعب ہوتا ہے۔ غضب نہیں ہوا کرتا۔ جاہلانہ اور مہذب جلالوں کو سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حالات سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ اسلام لانے سے پہلے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنی بہن اور بہنوئی کی تلاوتِ قرآن پاک سن کر بری طرح خبر لی اور اسی غصہ میں صاحبِ قرآن صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف کا رخ کیا۔ رُوئے انور کا جمال ملاحظہ کرتے ہی انکا جاہلانہ جلال مہذب جلال بن گیا۔ کلمہ پڑھتے ہی بنی اور اُن کے مہذب جلال نے خانہ کعبہ میں اذان دلوائی اور علانیہ باجماعت نماز پڑھوائی۔ کفار دیکھتے کے دیکھتے ہی رہ گئے۔ حضرت خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سرگزشت بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ جنگ اُحد میں پیٹھ پھیر کر بھاگے ہوئے جا رہے تھے۔ گھاٹی کے پچھلے حصہ کو مسلمانوں سے خالی دیکھ کر پیچھے سے حملہ کر دیا۔ اس اچانک حملہ سے مسلمانوں کے ہوش جاتے رہے اور آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا دندان مبارک تک شہید ہوگیا مگر مددِ الٰہی شاملِ حال تھی مسلمانوں کو کامیابی حاصل ہُوئی اور حضرت خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سوائے ایمان لانیکے کوئی چارہ نہیں تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے اسلامی جلال اور عدل کا ڈنکا بجوا دیا۔ اور حضرت خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی جلالی شمشیر کی دھاک بٹھا دی۔ ظاہر ہے کہ جلالی فطرت اپنی جگہ رہی مگر جلال شائستہ بنا لیا گیا تھا۔ اسی باشعور جلال کا نام شجاعت ہے۔ اسی شجاعت کی وجہ سے ایک

امیر المومنین ہوئے اور دوسرے سیف اللہ کہلائے۔ ان دونوں کے کارناموں کو دنیا بھلا نہیں سکتی۔ موسٰی علیہ السلام اور مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کے جلال کو قہر و غضب سمجھنے والے نہ جلال کو سمجھے اور نہ ان بزرگوں کے مراتبِ عُلیہ کو پہچان سکے۔ اصل یہ ہے کہ کیفیات جلال و جمال خداوندی عطیات ہیں۔ تنہا جلال جہالت و شیطنت ہے اور تنہا جمال بتختر و ناز ہے۔ امتزاج سے دونوں رحمت بن جاتے ہیں۔ جلال بغیر جمال کے ہیچ ہے اور جمال جس میں جلال نہ ہو ایک کھیل ہے اسے سمجھنے کے لیے جمال و جلال الٰہی پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے جمال الٰہی سے حیرت و سراسیمگی پیدا ہوتی ہے اس کیفیت کو خوف و دہشت کا اثر نہیں سمجھا جا سکتا۔ حسن میں دلکشی کے ساتھ رعب ہوتا ہے اور عشق میں خوف کے ساتھ شوق شامل ہوتا ہے۔ نشتر فصاد اگر خون نکالتا ہے تو زخم بھی اچھا کرتا ہے۔ قصاص میں جلال و جمال کا لزوم ہے جس آیت پاک میں شان قہاری کا اظہار ہے اس کے بعد ہی فوراً دوسری آیت شریف میں شان غفاری و کریمی کا بھی ذکر ہے۔ چنانچہ جلال و جمال کا حسین ترین امتزاج قرآنِ عزیز میں ملتا ہے جس طرح موسوی قوم پر موسٰی علیہ السلام نے نہیں بلکہ اللہ جل جلالہٗ نے عتاب فرمایا تھا اسی طرح کلیر میں بھی عتاب ہوا ہو گا۔ لیکن اس عتاب الٰہی کی جو کلیر میں ہوا تاریخ کو خبر نہیں۔ عقیدت جس کی بنیاد خوف پر ہو محبت سے واسطہ نہیں رکھ سکتی حیرت ہے کہ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کو غصہ۔ جلال۔ انتقامی جذبہ و نفسانیت سے منسوب کرنے میں تذکرہ نویسوں نے گستاخی کیوں محسوس نہیں کی اور معتقدین کو کیوں فریب میں مبتلا کیا۔ اگر ان کو روحانیت سے ذرا بھی حصہ ملا ہوتا تو اُنہیں اعلان کرنا چاہیئے تھا کہ جس کو انہوں نے جلالِ صابری ظاہر کیا ہے وہ در حقیقت روح کی تجلی تھا۔ اسی تجلی سے وہ عقیدت مندوں کو مستفیض کیا کرتے تھے اور کیا کرتے ہیں۔ اگر مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے فیض میں قہر شامل ہوتا تو سلسلہ کی ایسی

شاندار تبلیغ ممکن نہ ہوتی۔ اولیاء کی کرامتوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی کرامتوں سے دل کو تقویت ہوتی ہے اور یہ کرامتیں حق کی طرف راہنمائی کیا کرتی ہیں۔ اب جو کرامتیں مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کی بتائی جاتی ہیں ان سے عجوبیت پیدا ہوتی ہے اور عجوبیت گمراہی کی علامت ہے۔ عقیدت مند نسبت کی وجہ سے ہر رطب و یابس کو قبول کر لیتے ہیں اور ادب کی وجہ سے انکار نہیں کر سکتے۔ اسی لیے غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ دشمنوں کو اعتراض و انکار کا موقع مل جاتا ہے۔ یہ قطعی ناقابل قیاس ہے کہ کلیر کی مسجد اتنی طویل و عریض تھی جتنی ظاہر کی گئی ہے اور خدا جانے جمعہ کی نماز کے لیے پانچسو پالکی سوار کہاں سے آجاتے تھے۔ یہ بھی صحیح نہیں کہ دموآن جیسے سرکش حاکم اور تبرک جیسے متمرد قاضی سلطان ناصر الدین اور غیاث الدین بلبن کے عہد میں ہوں۔ یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ صاحبان ولایت کا دعوٰی کرنا تو درکنار اپنے آپ کو ظاہر بھی نہیں کیا کرتے جو بزرگ خلیفہ و مبلغ ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہیں وہ اخلاق الٰہی سے متصف ہوتے ہیں اور اپنی روحانیت سے بغیر ذاتی نمائش کے ہدایت کیا کرتے ہیں۔ صاحبانِ ولایت رموز و اشارات سے کلام کرتے ہیں اور اپنے سرِ باطن کہیں افشاء نہیں ہونے دیتے اس کے علاوہ انبیاء و رسُول تک کسی کو مجبور نہیں کر سکتے۔ ان کا فرض پیغام الٰہی کو پہنچا دینا ہے اور بس۔ مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کو جب مسجد کی صف آخر میں دھکیل دیا تو کہا جاتا ہے کہ انہوں نے قہر کا اظہار کیا۔ قرب و جوار کے باشندوں کو اس قہر کی خبر نہیں۔ حکومت کو بھی اس کا علم نہیں اور مؤرخین بھی اس کے متعلق خاموش ہیں۔ سلطان ناصر الدین محمود اپنے نویں سال جلوس کے بعد بدایوں تشریف لائے تھے پھر ڈاکوؤں کا استقبال کرنے کوہ ہمالیہ کے دامن میں جو بجنور کے شمال میں ہے، گئے تھے۔ سلطان نے ہردوار کے قریب مایا پور کے مقام پر گنگا کو

عبور کیا تھا۔ اس دورے کی تاریخ ۶۵۲ھ ۱۲۵۴ء ہے۔[1] شاہی افواج کلیر کے جنگل میں ڈاکوؤں کی تلاش میں گشت کر رہی تھیں۔ انہوں نے نہ آگ دیکھی اور نہ جلنے کے آثار انہیں دکھائی دیئے لیکن اگر اس آگ کا ذکر بطور استعارہ ہے تو مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی روحانیت سے روشنی پھیلائی۔ کفر و ظلمت کو دور کیا اور انوارِ الٰہی سے دور دور اس نواح کو منور فرما دیا۔

وصال کے بعد والے فیض کی تفصیل عجیب و غریب ہے۔ یعنی مزار پہ برق جلال تڑپنے لگی۔ کسی کو قریب نہیں آنے دیتی تھی۔ امام صاحب کے روضہ سے دو سُرخ پتھر لاکر حضرت شمس الدین ترک پانی پتی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے مزار اس طرح بنایا تھا کہ ان پتھروں کے درمیان جسد مبارک رکھ دیا تھا۔ پھر مٹی چڑھا کر قبر کی صورت بنا دی تھی۔[2] سنیاسی کی گستاخی کے بعد مجاوروں نے ۹۰۷ھ میں خام مزار کی مرمت کر دی تھی۔[3] عرصہ دراز کے بعد حضرت شیخ عبد القدوس رح نے ۹۲۳ھ میں مزار مبارک کو پختہ بنایا تھا۔[4] اسی موقع پر سیدنا شیخ عبد القدوس نے برق جلال کو تنزیہ کے غلاف میں بند کر لینے کی درخواست کی تھی۔ کشفی تذکرہ حقیقتِ گلزار صابری راوی ہے کہ پختہ مزار ۹۰۷ھ میں بنوایا گیا تھا۔ مزار کے پختہ ہو جانے کے بعد برق جلال خاموش ہو گئی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جسکو برق جلال سمجھا گیا وہ رُوحِ مقدس کی تجلی تھی جو آج بھی رات کے وقت چشمِ بینا کو نظر آجاتی ہے۔ کشف و کرامات اگر صحیح بھی ہوں تو بھی وہ کمالات صوری ہیں اور شرطِ ولایت نہیں ہیں جن اولیاء

---

1. طبقاتِ ناصری ۶۵۳ھ میں حضرت جمال ہانسوی رحمۃ اللہ علیہ بھی حیات تھے۔
2. گلزارِ حقیقت صابری حدیقۃ الاولیاء مرتبہ غلام سرور لاہوری۔
3. ماخوذ از سہ ماہی رسالہ اردو اکتوبر ۱۹۶۷ء کراچی۔
4. بروایت سیر الاقطاب پختہ قبر بادشاہ جہانگیر نے بنوائی تھی اور روضہ سکندر لودھی نے تعمیر کروایا تھا۔

پر ارتفاعِ تعینِ جسمانی کی وجہ سے مردے کا لفظ عائد ہو گیا ہے ان کے مزارات پہ زائر بغیر کیفیات موت طاری کئے ہوئے ان کا ہم جلیس نہیں ہو سکتا اور نہ ان سے ملاقات کر سکتا ہے۔ ظاہری موت طاری کرنے کی دو صورتیں ہیں۔ یا محویت یا خواب۔ اس طرح کی موت طاری کر لینے کے بعد جو استفادہ ہوتا ہے۔ اسے فیضِ خاص کہتے ہیں۔ اور اسی عالم و کیفیت میں ملاقات و گفتگو بھی ہو جاتی ہے۔ فیض عام یہ ہے کہ مزارات اولیاء پہ حاضر ہونے والوں کو صاحب مزار اپنا مہمان سمجھا کرتے ہیں اور مہمان کی سی خاطر و تواضع کرتے ہیں۔ اس فیض عام کا احساس اکثر حاضر ہونے والوں کو ہو جاتا ہے مگر شبہ سے خالی نہیں ہوتا۔ اس قسم کا مشابہ انبیاء کرام علیہم السلام کو بھی ہوا ہے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے باری تعالیٰ کی تجلی کو پہلے آگ سمجھا تھا۔ اور اپنی اہلیہ سے کہا تھا کہ آگ لے آؤں۔ جب وادی ایمن میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ جس کو انہوں نے آگ خیال کیا تھا۔ وہ باری تعالےٰ کی تجلی تھی۔ اسی قسم کی تجلی اکثر مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پہ دکھائی دیتی ہے۔ جس کو نافہم برقِ جلال سے موسوم کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسا مغالطہ فقدان معرفت کی وجہ سے پیدا ہوا اور اس کے متعلق طرح طرح کی کہانیاں گھڑ لی گئیں۔ اس تشریح کے بعد اگر فیوض و کرامات کی حقیقت سمجھ لی گئی تو ایسی واہی روایتیں ناقابلِ اعتماد ہوں گی۔

حیرت ہے کہ کسی نے مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی تعلیم و تلقین کی وضاحت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اور نہ ان کا کوئی ارشاد درج کیا۔ بزرگوں اور ولیوں کی عظمت و جلالت شان، ان کے تقوے اور خشیت سے سمجھی جاتی ہے۔ ان تذکروں میں ایک روایت بہ لحاظ معنی دلچسپ و لطیف ہے مگر اس کی واقعاتی صورت کچھ نہیں ہے کہتے ہیں کہ حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قوال سیر کو نکلے دہلی میں سلطان المشائخ

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے شاندار خاطر و تواضع فرمائی اور انعام و اکرام سے نوازا اس کے بعد یہ قوال کلیر پہنچے تو وہاں عالم ہُو تھا۔ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ برآمد ہوئے اور قوالوں سے حضرت شیخ کی خیریت دریافت کرنے کے بعد یہ فرمایا گولڑوں میں نمک ڈال دیا جائے اور وہ گولڑ ہی نذر بھی کیئے۔ اتنی ملاقات کر کے حجرہ میں چلے گئے۔ قوالوں نے اجودھن پہنچ کر دونوں صاحبان کی تواضع کا حال بیان کیا یہ سُن کر کہ مخدوم نے میری خیریت دریافت کی تو وجد آگیا اور فرمایا جب صابر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مجھے شیخ کہہ دیا تو اب میں واقعی شیخ ہو گیا۔ درپردہ شکایت کرنے کے بعد قوالوں نے صابری گولڑ بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ڈال دیئے۔ وہ حاضرین میں تقسیم کر دیئے گئے۔ جس نے کھائے وہ ولی ہو گیا بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے قوالوں کو دونوں صاحبان کی تواضع کی حقیقت سمجھائی کہ صابر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ عاشقِ الٰہی ہے اور سیدِ نظام الدین بدایونی رحمۃ اللہ علیہ محبوب الٰہی ہیں۔ لہذا دونوں نے اپنی خصوصیت کے ساتھ پوری تواضع کی۔ یہ روایت واقعیت سے بعید ہے اس زمانہ میں حضرت سلطان المشائخ زلزال شدید میں مبتلا تھے اور خود لکھا ہے کہ اس زمانہ میں ایک دمڑی کے کئی سیر خربوزے بکتے تھے مگر میں اپنی عسرت کی وجہ سے خرید نہ سکا۔ اس روایت کو اگر زلزال شدید کے بعد کا قصہ سمجھا جائے تو مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہو چکا تھا۔ سلطان المشائخ رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کو زلزال شدید سے نجات ۶۸۵ھ میں ملی تھی اور مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کی صحیح تاریخ ۶۸۹ھ ہے

ان واہی روائتوں کو خارج کر دینے کے بعد ان تذکروں کے صفحے کورے اور سپاٹ رہ جاتے ہیں۔ خدا کو کسی نے دیکھا نہیں ہے مگر عقل سے پہچانا ہے معرفت کے دو ہی طریقے ہیں۔ نفی و اثبات ابراہیم علیہ السلام نے چاند تاروں اور سورج کی نفی کرتے کرتے

خدائے لایزال کو پا لیا۔ نفی اگر حق کی کی جائے تو حق پر آنچ نہیں آتی اور نفی خود شرمندہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ حق کا ظن و گمان سے کوئی تعلق نہیں۔ ظنیات سے اطمینان حاصل نہیں ہوتا۔ فلسفہ الجھایا کرتا ہے۔ اس کا تعلق خیالی دنیا سے ہے۔ عملی زندگی فلسفہ سے نہیں بنا کرتی۔ ظن و تخمین سے روح مردہ ہو جاتی ہے۔ حضرت نبی الامی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خدا تک پہنچنے کا اثبات کا طریقہ سکھایا ہے قرآن عزیز کے معنی سمجھائے۔ خود عمل کر کے قرآنی تعلیم کو واضح کیا۔ اُسوۂ حسنہ کی پیروی سے قلب و زباں میں تعاون ہو جاتا ہے۔ مغائرات دور ہو جانے کے بعد مشاہدات کے ذریعہ وحدہٗ لاشریک جل جلالہٗ کی بارگاہ تک رسائی ہو جاتی ہے۔ اخلاق الٰہی مل جاتے ہیں اور یقین کامل ہو جاتا ہے مختصر یہ کہ حق باطل کُش ہے اور کسی طرح باطل کا محتاج نہیں ہوتا۔ جب سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے باطل کی نفی کر کے خدائے لایزال کو پا لیا اور روحی فداہ حضرت رسولِ عربی صلوٰۃ اللہ علیہ اثبات کے ذریعہ قاب قوسین تک تشریف لے گئے اور معراج حاصل کی تو حضرت مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو سمجھ لینا تو کوئی مشکل ہی نہیں۔ اصل نفی یہی ہے کہ اثبات مدنظر رہے لا کی مشق میں اگر اللہ کو خبط کر دیا گیا تو ایسی نفی مذموم اور کفر ہے۔ اگر توہمات کا حجاب نہ ہو تو ولی کی روحانیت خود اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ ولی چونکہ اخلاق محمدی سے آراستہ ہوتا ہے تو باوجود جلالی فطرت رکھنے کے تعلیم نبوی سے سرمو تجاوز نہیں کر سکتا۔ لوگوں نے اپنے ذاتی وہم و خوف کی وجہ سے کیوں سمجھ لیا کہ مخدوم پاک نے دلوں میں خوف ڈال دیا تھا۔ ولی کا فرض اور کام یہ ہے کہ اس قسم کے پردوں اور موانعات کو دور کرے لیکن لوگ خود بینی و خود رائی کی وجہ سے فائدہ اٹھانے سے محروم رہتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ مخدوم پاک کی تعلیم و تبلیغ میں کوئی ظاہری پہلو نہیں تھا۔ ان کی تسخیر

باطنی تھی۔ اپنی طرزِ سلوک سے نامعلوم طور پر قلوب میں صحیح جذبہ پیدا کر دیتے تھے۔ ظاہری حیات میں جو کرامات ان سے صادر ہوئیں وہ مُرورِ زمانہ کے سبب یاد سے محو ہو گئیں یا ان میں تبدیلی کر دی گئی۔ اب یہ بے معنی و بے تاثیر روائتیں جو حضرت کے وصال سے تقریباً چار سو سال بعد لکھی گئی ہیں ان کو نظر انداز کر کے ان کے عام درویشوں جیسا ہی تصور جمایا جائے تو بھی ان کی عظمت نمایاں ہو جاتی ہے۔ یوں سمجھا جائے کہ وہ معمولی فقیروں کی طرح کلیر میں داخل ہوئے نہ انہوں نے اپنا تعارف کروایا اور نہ کسی نے ان کی بات پوچھی وہ ایک جگہ چپ چاپ کھڑے ہو گئے۔ آخر کار ان کی بے نیازی و خستہ حالی پہ خستہ حالوں نے ہی ترس کھایا۔ جس جگہ کھڑے تھے وہاں ایک بوڑھی عورت گلزاری کا جھونپڑا تھا وہ اور اس کے ہمسایہ مفلوک الحال تھے۔ سب کے کہنے سننے سے گلزاری کے یہاں قیام پر راضی ہو گئے مگر زیادہ وقت قریب کے گولڑ کے درخت کے نیچے گزرتا تھا[1] ان کے مرشد اعظم حضرت شیخ کبیر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بھی اجودھن میں کریل کے درختوں کے نیچے قیام پذیر ہوئے تھے۔ اور ان درختوں کی چھال اور پتے ابال کا نوشِ جان فرمایا کرتے تھے۔ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ پہ اکثر استغراقی کیفیت طاری رہتی تھی۔ ان کا بولنا چالنا نہ بولنے چالنے کے برابر تھا۔ جسم کے لیے لباس۔ خوراک اور آزار لازمی ہیں۔ ان کی خوراک بے نمک کے اُبلے ہوئے گولڑ تھے۔ قلتِ طعام۔ قلتِ منام اور قلتِ صحبتِ انام ان کی خصوصیات تھیں۔ لباس میں کرتے۔ تہمد اور عمامے کے علاوہ ایک رومال بھی تھا جو زیب گلو رہتا تھا۔ کپڑے جب میلے ہو جاتے تو دھو لیے جاتے جب پھٹ جاتے تو کوئی نہ کوئی نذر کر دیتا۔ بیماری کو

---

[1] گلزاری کا جھونپڑا وہاں تھا جہاں اب حضرت کا مزار ہے۔ مسجد امام صاحب کے مزار کے قرب و جوار میں تھی۔ وہیں نماز پڑھنے جایا کرتے تھے۔

انہوں نے مرض نہیں سمجھا۔ درد دُکھ کی وجہ سے ان کے معمولات میں کبھی فرق نہیں آیا۔ موسم کے انقلابات کا بھی کوئی اثر نہ ہُوا۔ وہ مرنجاں و مرنج تھے۔ دیکھنے والوں کی سمجھ میں ان کے واردات نہیں آتے تھے۔ ان کے حالات و معمولات بذاتِ خود کرامات تھے۔

اس ناخواندہ و اجنبی مہمان کے قریب بیٹھ کر لوگ آپس میں چہ میگوئیاں کیا کرتے تھے جس سے ان کا وقت آسانی سے کٹ جاتا تھا۔ ہر شخص انہیں اپنا سمجھتا تھا مگر وہ سب سے بے نیاز تھے۔ ان کی خاموشی میں کشش تھی۔ ان کی بے لوثی و بے نفسی کا ہر شخص معترف تھا۔ کسی نے انہیں ہنستے نہیں دیکھا۔ اور نہ انہیں کسی بات پر کبھی غصہ آیا۔ ان کی محویت میں دنیوی حوادث کبھی رخنہ انداز نہیں ہوئے۔ وہ نماز پڑھتے تھے اور ان سے سب کو دلچسپی تھی مگر ان کی خُوبُو کی کسی کو ہَوا بھی نہیں لگی۔ عام افواہ تھی کہ وہ بولتے نہیں ہیں مگر جب کبھی بولتے تو ایک ہی فقرے میں اکثر حاضرین کے دلی سوالوں کا جواب دے دیتے تھے۔ یہ بھی مشہور تھا کہ ایک ہی وقت میں قریب بعید کے مختلف مقامات پر لوگوں نے انہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے ہر کام کرامت ہی کے ذریعہ کیا مگر اظہار و دعویٰ نہیں کیا۔ اگر کوئی کرامت کا ذکر بھی کرتا تو اس طرح ٹال جاتے کہ گویا ان سے کچھ واسطہ نہیں۔ وہ دنیا کی رونق نہیں تھے لیکن دنیا کی رونق ان سے ہی تھی۔ وہ تارک الدنیا تھے مگر دنیا کی اصلاح ان کی فطرت و فرائض میں داخل تھی۔ مسلمانوں نے انہیں مست مولا سمجھا۔ ہنود نے "پرم ہنس" خیال کیا۔ امیروں سے وہ نہیں ملے۔ لوگوں نے دیوانہ سمجھا مگر انہوں نے پروا نہیں کی۔ دنیا انہیں سمجھی یا نہیں سمجھی مگر وہ اپنا کام کر گئے۔

ظاہری تذکروں میں کوئی ذکر نہیں ہے مگر کشفی تذکروں میں ان کے دو تین ارشاد مذکور ہیں۔ نماز کے لیے جب ہوشیار کیے جاتے تو فرماتے "شریعت بھی کیا چیز ہے جو حضوری سے دربار میں لے آتی ہے" نماز کے لیے طہارت و ستر پوشی ضروری ہے۔

وہ ان شرائط کو ملحوظ رکھتے تھے۔ کپڑے گُل ارمنی سے رنگتے تھے۔ اس مختصر ارشاد سے خلوت و جلوت کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ ثابت ہوا کہ سُکر و صحو دونوں حالتوں میں شریعت کا پاس رکھتے تھے۔ جب غذا پیش کی جاتی تو کہتے کہ "بندہ کھاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کھانے سے بے نیاز ہے" بندگی اور الوہیت کی اس سادہ تعریف پر ہزاروں فلسفے قربان کئے جا سکتے ہیں۔ جب فنائیت میں کریم کارسانہ بمقام رحمت فرما دیتا ہے تو صوفی اس مرتبہ کو "جمع الجمع" سے موسوم کرتے ہیں۔ اسی کا دوسرا نام "وحدت الوجود" ہے۔ اسی کو نقشبندی حضرات "قیُومیت" سے تعبیر کرتے ہیں۔ بندے کی ترقی کا یہ آخری مقام ہے۔ بندہ مولا صفات بنا دیا جاتا ہے مگر ذاتِ واجب الوجود ہر معیار و قیاس سے اعلیٰ و بالا ہے۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ پر ایمان رکھنے والے اور حضور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کو عبد اور رسُول سمجھنے والے وہم و خیال میں بھی تصور نہیں کر سکتے کہ بندہ خدا بن جاتا ہے۔ مولا صفات بن جانے پر جو اختیارات حاصل ہوتے ہیں وہ ذاتی نہیں ہوتے بلکہ عطائی ہوتے ہیں۔ اللہ ذو الفضل العظیم۔

مخدوم پاک کا مندرجہ بالا تعارف قیاس معتبر کی حیثیت رکھتا ہے مگر پھر بھی قیاس ہے۔ لہٰذا ان جیسی بزرگ و عالی ہمم ہستی کی صحیح تعریف ان کے کارناموں سے سمجھی جائے تو بہتر ہے۔ ان کے کارنامے چونکہ بامعنی تھے لہذا سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ سب جانتے ہیں کہ انہیں خلافت و ولایت کے دو منصب حاصل تھے۔ خلافت سلسلے کی تنظیم و تبلیغ کے لیے عطا کی جاتی ہے اور ولایت کا منشا روحانی انتظامات سے ہے۔ دستارِ خلافت اعلانیہ کیا جاتا ہے اور معاملات ولایت باطنی ہوتے ہیں۔ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی تبلیغ و اشاعت ابتداء میں مخفی رہی بعد میں حریم نور سے نکل کر سلسلہ کی اشاعت نورٌ علیٰ نور ہوئی۔ سلسلہ کا چلنا ان کی بہترین کرامت ہے۔ انہیں مجذوب سالک کے درجہ میں خلافت

عطا کی گئی تھی۔ مجذوب سالک نیمے دروں نیمے بروں ہوتے ہیں ان کی کارگزاریاں سالک کامل کی طرح اعلانیہ نہیں ہوتیں۔ لہٰذا مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی تبلیغ خاص قسم کی ہے انہوں نے جماعت خانہ بنایا۔ نہ لنگر جاری کیا۔ نہ درس و تدریس کی مجلس قائم کی اور نہ کسی طرح سے اشتہار دیا۔ وہ گمنام ہی رہتے مگر کار خلافت کی وجہ سے ظاہر ہونا پڑا۔ ولایت کے کارناموں کا اعلان نہیں ہوا کرتا۔ اور کسی نوعیت سے ولایت کا اظہار و دعویٰ بھی نہیں کیا جاتا مگر باوجود بے ہمہ و باہمہ ہونے کے مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے اخلاق و طرز میں نامعلوم روحانی تسخیر و کشش تھی اور ہے۔

کمالات ہیں کہ حضرت مخدوم قدس سرہُ العزیز کے قیام کلیر کی مدت اور سالِ وصال کا تعین نہ کیا جا سکا۔ واقعہ ہے کہ ۶۴۶ھ میں ولایت حاصل کر کے کلیر تشریف فرما ہوئے تھے۔ اب اگر کسی طرح تاریخ وصال کا تعین ہو سکے تو قیام کی مدت بھی معلوم ہو سکتی ہے بادی النظر میں قیام کی مدت حضرت ترک پانی پتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے واقعات سے طے کی جا سکتی ہے۔ ملفوظات کے مطابق حضرت ترک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بعد بیعت کلیر سے حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی خدمت میں اجودھن چلے گئے تھے۔ پھر بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے وصال کے بعد کلیر آتے تھے۔ اور آخر تک یہیں رہے۔ اس مرتبہ حضرت ترک رحمۃ اللہ علیہ یہاں آ کر اٹھارہ سال رہے تھے۔ روایت ہے کہ حضرت مخدوم علیہ الرحمۃ نے دکن کے جہاد میں شریک ہونے کا حکم دیا تھا اور فرمایا تھا کہ "جس روز تمہاری دعا سے دکن کا قلعہ فتح ہوگا اسی روز دنیا سے ہمارا کوچ ہوگا۔ تم فی الفور یہاں آ کر ہماری تجہیز و تدفین کرنا اس کے بعد تیسرے روز پانی پت چلے جانا"۔ تاریخ نہیں بتاتی کہ دکن کا کونسا قلعہ حضرت ترک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی دعا سے فتح ہوا تھا۔ تاریخ کا مصدقہ بیان ہے کہ ۶۶۴ھ میں تخت

نشین ہو کر سلطان غیاث الدین بلبن نے دکن کی جانب کبھی کوئی حملہ نہیں کیا۔ بلبن کا انتقال ۶۸۶ھ میں ہوا تھا۔ معلوم نہیں تذکرہ نویسوں نے اس نامعلوم دکنی قلعہ کے فتح کرنے کا سہرا بلبن کے سر کیسے باندھ دیا۔ بہ حیثیت سپہ سالار ہونے کے جلال الدین خلجی نے قلعہ جھنبور کا محاصرہ کیا تھا اور بغیر تسخیر کیے ہوئے ۶۸۹ھ میں واپس چلا آیا تھا۔ اس کے بعد جب جلال الدین سلطان بن گیا تو دکن میں اس نے متعدد کامیاب حملے کئے۔ کشفی تذکرہ کا الہام ہے کہ آمیر کا قلعہ جلال الدین خلجی کے عہد میں اس کے سپہ سالار علاءالدین خلجی نے ۶۸۹ھ میں فتح کیا تھا۔ اس کے سال بھر بعد مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا وصال ۶۹۰ھ میں ہوا۔" آمیر کے قلعہ کی تسخیر کے متعلق اس کشفی تذکرہ "حقیقت گلزار صابری" نے تاریخ فیروز شاہی کی سند لکھی ہے اور وہ اس طرح کہ حضرت سلطان المشائخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے جلال الدین کی درخواست پر فرمایا تھا کہ دکن کے لشکر میں ترک پانی پتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ موجود ہیں۔ ان کی دعا سے قلعہ آمیر فتح ہوگا۔ لہٰذا ان سے رجوع کی جائے۔" اب تاریخ فیروز شاہی کا بیان بھی قابلِ ملاحظہ ہے۔ لکھا ہے کہ جلال الدین خلجی نے کسی مہم کے بارے میں حضرت سلطان المشائخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے کبھی کوئی درخواست نہیں کی۔ البتہ علاءالدین خلجی اپنی مشکلات کے متعلق حضرت سلطان المشائخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے دعا کی درخواست کیا کرتا تھا۔ چنانچہ جناب پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب نے اپنی کتاب "سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات" میں لکھا ہے "حالانکہ سیاسی و روحانی بادشاہوں کا قران السعدین نہ ہو سکا لیکن . . . . علاءالدین خلجی مشکلات کے وقت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی دعاؤں کا طالب رہا۔ جب وارنگل کی طرف بھیجے ہوئے لشکر کی اطلاع کافی دنوں تک نہیں ملی تو سلطان علاءالدین خلجی نے شیخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی طرف رجوع کیا . . . . شیخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے سلطان کا پیغام سن کر فرمایا کہ "یہ فتح

کیا حقیقت رکھتی ہے۔ ہم تو اس سے بھی بڑی فتوحات کی اُمید رکھتے ہیں"؛ یہ مختصر جواب بلاغت و کرامت کی جان ہے۔ ثابت ہوا کہ کشفی تذکرہ نے از روئے کشف تاریخ فیروز شاہی کا جو حوالہ دیا ہے وہ از سر تا پا غلط ہے۔ بعض تذکروں میں قلعہ آمیر کے بجائے وارنگل کی فتح کا ذکر ہے لیکن وارنگل کی فتح ۷۰۹ھ میں ہُوئی ہے۔ حال کے ایک تذکرے نے اپنی تحقیق کے مطابق لکھا ہے کہ اس سال بہ عہدِ بلبن قلعہ چتوڑ فتح ہُوا تھا۔ مگر یہ بھی غلط ہے اس لیے کہ قلعہ چتوڑ علاءالدین خلجی نے ۷۰۳ھ میں فتح کیا تھا۔ ایک اور ماہر تاریخ رقمطراز ہیں کہ اسی سال ۶۹۰ھ میں جلال الدین خلجی نے قلعہ آمیر فتح کیا تھا۔ معلوم نہیں ان صاحب نے کس تاریخ سے یہ لکھ دیا ہے۔ اس کے علاوہ ہر سوانح نگار نے اپنے اپنے قیاس سے مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے وصال کے مادہائے تاریخ نظم کئے ہیں مگر یہ سب افکار مابعد ہیں اور افواہوں پر مبنی ہیں۔ خزینۃ الاصفیا اور مدارج الولایت میں مادہ تاریخ "مخدوم" درج ہے اس سے ۶۹۰ھ کا سال نکلتا ہے۔ مگر یہ بھی قیاسی ہے۔ شجرہ چشتیہ میں جو تاریخ لکھی ہے اس کی تصدیق و تطبیق تاریخی واقعات سے ہو جاتی ہے اور وہ سال ۶۷۹ھ ہے۔ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا وصال بلبن کے عہد میں ہوا تھا۔ حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے وصال کی تاریخ سے مخدوم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے وصال ۶۷۹ھ کی تائید ہو جاتی ہے۔ بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے وصال کا صحیح سال بروایت حضرت سلطان المشائخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ۶۶۱ھ ہے۔ اس کے بعد حضرت ترک کلیر میں اٹھارہ برس رہے ہیں اور یہ اٹھارہ برس کی مدت ۶۷۹ھ میں پوری ہوتی ہے۔ جب سال وصال ۶۷۹ھ مُسلّم ہے تو صاف ظاہر ہے کہ مخدوم رحمۃ اللہ علیہ نے کلیر میں تینتیس ۳۳ سال خلافت و ولایت کے فرائض حسن و خوبی سے ادا کئے۔

صحیح حالات معلوم کرنے کی بظاہر کوئی صورت نہیں لیکن مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کی شہرت ومقبولیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ان کا سلسلہ دھوم دھام سے چل رہا ہے۔ ان کی تعلیم میں تاثیر ہے۔ ان کی یاد بھلائی نہیں جاسکتی وہ زندہ ہیں۔ ان جیسے مجذوب سالک کے لیے کلیر کی ویرانی ہی مناسب وموزوں تھی۔ خدا جانے کہاں تک صحیح ہے کہ دنیوی معاملات روحانی انتظامات کے تحت ہُوا کرتے ہیں۔ یعنی عالمِ بالا کے احکامات و انتظامات کی نقل عالم اسباب اور مادی دُنیا میں کی جاتی ہے۔ عبداللہ بن علی الحکیم ترمذی (بانی سلسلہ حکیمیہ) کا تصور مندرجہ آیات پر مبنی ہے کہ کل دنیا اللہ کے ولیوں میں تقسیم ہے ہر علاقہ کسی نہ کسی ولی کے تحت میں ہوتا ہے[1]۔ اس اصُول کے مطابق مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کی ولایت کلیر کی مدت ۶۴۶ھ سے ۶۷۹ھ تک ہے۔ اس مُدت کی تطبیق سلطان ناصر الدین محمود (۶۴۲-۶۶۴ھ) اور سلطان غیاث الدین بلبن (۶۶۴-۸۵ھ) کے عہدوں میں ہوتی ہے۔ ان دونوں سلاطین کے طرزِ حکومت سے مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے روحانی انتظام کی ٹوہ لگائی جاسکتی ہے۔ ناصر الدین محمود رحیم وکریم وعادل اور دیندار تھا۔ اور بلبن نے بحیثیت وزیر وسلطان اپنے جلال وجمال سے ایسا امن قائم کیا تھا کہ جس کی نظیر نہیں ملتی۔ ان دونوں سلاطین کے کارنامے روحانی انتظام کے چربے ہیں۔ اس طرح اسی سے مخدوم پاک کی کارفرمائی اور فراست کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اگر یہ اصول صحیح ہے تو تذکار نگاروں کی تراش خراش مہمل ٹھہرتی ہے۔ اس تطبیق سے صاحب کلیر کی تصویر آنکھوں میں آجاتی ہے۔ حضرت کے حالات بھی عجیب وغریب ہیں۔ انہیں

[1] سورہ ص آیت نمبر ۶۹۔ اس کی تفصیل اسی سورہ کی آیات نمبر ۱۷ تا ۸۶ میں ملاحظہ کر لی جائے۔ مطلب یہ ہے کہ ملاءِ اعلیٰ میں دنیوی معاملات طے کیے جاتے ہیں۔

ظاہری علوم کی تعلیم دی گئی تھی۔ ان کے مجاہدات بھی مُسلّم ہیں۔ ان کی خلافت علی الرغم عدو ثابت ہے۔ ان کی ولایت کی عام شہرت ہے اور درجۂ مقبولیت رکھتی ہے۔ تزاع ہانسی کی حکایت جو غلط العام ہونے کی وجہ سے معتقدین کی زبان پر ہے۔ اس کا شمّہ بھر بھی وجود نہیں۔ حیرت ہے کہ معتقدین ان بے سروپا روایت پر نہ صرف عقیدہ رکھتے ہیں بلکہ ان کے صحیح ہونے پر اصرار کرتے ہیں۔ مگر بایں ہمہ مخدوم پاک کی تعلیم مردہ دلوں کو حیات بخشتی ہے اور زندہ کر دیتی ہے۔

دیکھو تو دلفریبیٔ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گُل کتر گئی

خُلاصہ

(۱) بعد حصولِ خلافت عمر ۳۳ سال ۶۴۶ھ میں مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کلیر کو روانہ ہوئے۔

(۲) کلیر کی آبادی میں ھنود کی کثرت تھی اور مسلمان قلت میں تھے۔

(۳) کلیر کی مسجد میں خلاف شرع سونے چاندی کے ظروف نہیں ہو سکتے تھے۔

(۴) یہاں کے حاکم وقاضی وہ نہیں تھے جن کے نام لکھے گئے ہیں۔

(۵) صاحبانِ ولایت دعوٰی ونمائش نہیں کیا کرتے۔

(۶) مخدوم پاک ایک ہی سانس میں صفت صبر اور صفت جلال سے متصف نہیں کیئے جاسکتے۔ کیونکہ صبر وجلال کا یکجا جمع ہونا محال ہے۔

(۷) مسجد کا ڈھانا اور کلیر میں آگ لگا دینا خواب پریشان ہے۔

(۸) باطل پرست روح کی تجلی کو اپنی حماقت سے حلال سمجھے۔

(۹) حضرت سلطان المشائخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ میں ظاہری ملاقات نہیں ہوئی۔

(۱۰) ناصر الدین محمود اور بلبن کا طرز حکومت مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کے روحانی انتظام کا چربہ ہے۔

(۱۱) خلافت و ولایت کے شعبے جُدا جُدا ہیں۔ کار خلافت علانیہ ہوتا ہے۔ اور انتظام ولایت باطنی و مخفی ہوتا ہے۔

(۱۲) حضرت ترک پانی پتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا بلبن کی فوج میں شامل ہونا اور ان کی دعا سے دکن کے کسی قلعہ کا فتح ہو جانا محض افسانہ ہے۔

(۱۳) مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی عمر ۶۶ سال کی ہوئی۔

(۱۴) مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا وصال عہد بلبن میں بسال ۶۷۹ھ ہونا صحیح اور معتبر ہے۔

تذکرہ جات صابری

جو میکدے سے اُڑے اُس خبر کو کیا کہیئے

صوفیوں میں شیخ کے ارشادات محفوظ کر لینے کا دستور رہا ہے۔ ان ارشادات کے مجموعہ کو ملفوظات کہتے ہیں اور شیخ کے حالات و سوانح جو لکھے جاتے ہیں وہ تذکرے کہلاتے ہیں۔ درویشوں کے سوانح ان کے واردات کیفیات و احوال پر مبنی ہوتے ہیں لہٰذا ان کو سمجھ لینا آسان نہیں۔ ان کے حالات بر بنائے عقیدت لکھے جاتے ہیں اس لیے مفہوم وتناسب کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا تاریخی لحاظ سے ان تذکروں کو مکمل نہیں سمجھا جا سکتا۔

مشہور ہے کہ حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر قدس سرہُ العزیز کے بیشمار خلیفہ تھے۔ ان میں مخدوم علاء الدین علی احمد صابر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی شخصیت نمایاں اور عظیم ہے۔ ان کے متعلق جتنے بھی تذکرے معتقدین نے لکھے ہیں وہ کچھ عجیب سے ہیں ان کے کارناموں میں محض کرامات ہی کرامات ہیں اور کرامات بھی عجوبیت سے بھری ہوئی ہیں اور عقل و آئین سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں ان کے ابتدائی حالات پردۂ خفا میں ہیں اور بعد والے چیستاں بنا دیئے گئے ہیں۔ متداول تذکرے صحیح تعارف کرانے سے معذور ہی نہیں بلکہ کلیتہً ناکام ہیں۔ وجہ یہ کہ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کے استغراق کی وجہ سے ظاہری اسباب کی طرف التفات نہیں تھا اور ان کے اصحاب وجاں نثار خود بھی مستغرق رہے ہیں

صابریوں کے پردۂ خفا میں رہنے کے زمانہ میں عجائب پرستی کا دور دورہ تھا معقولات کا رواج ہو گیا تھا اور عقائد کی صورت بگڑ گئی تھی۔ پھر ہوا یہ کہ نظامیوں اور سہروردیوں میں چل گئی۔ جب نظامی اپنے سلسلہ کی اشاعت کے لیے مختلف سمتوں میں چلے گئے تو بظاہر شمالی ہند تعلیم چشتیہ سے محروم سا ہو کر رہ گیا۔ اس غیابت الجُب کی حالت اور زمانہ میں حضرت شیخ العالم احمد عبدالحق ردولوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے حضرت یوسف علیہ السلام کی طرح اپنے جمال و جلال کو ظاہر کیا۔ اگرچہ وہ بھی مجذوب سالک تھے مگر صابری تعلیم کی انہوں نے علانیہ اشاعت فرمائی۔ ردولی میں خانقاہ بنائی اور لنگر بھی جاری کیا۔ مگر چند دن کے بعد ان ظاہری طریقوں سے دست بردار ہو گئے۔ بقول شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مجذوب سالک کی توجہ، سالک کامل سے زیادہ قوی اور زود اثر ہوتی ہے۔

لہٰذا صابری تعلیم شیخ العالم کی کوششوں سے ظاہری طور پر بھی خوب پھلی پھولی۔ اس غیر معمولی اور اچانک تجدید نے معاصرین کو حیران کر دیا۔ آتش حسد بھڑک اٹھی۔ مخالفت کی ایک ہی صورت تھی کہ مغالطے پیدا کئے جائیں۔ نئی روایتیں تراشی جائیں اور خوب بدنامی رسوائی کی جائے۔ سیاسی و اقتصادی انتشار و انحطاط کی وجہ سے عقائد میں بھی خلل پڑ جایا کرتا ہے۔ لہٰذا اس عہد کے صوفیوں نے بھی رنگ بدلا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رنگوں کے مختلف ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کی اہانت و مذمت کرنے لگے۔ صابریوں نے معترضین کی لغویات کا جواب ضرور دیا لیکن وہ از قسم منطق تھا۔ "تاریخ مشائخ چشت" کے فاضل مصنف جناب خلیق احمد نظامی صاحب نے بجا طور پر اشارہ کیا ہے کہ "اُن کے (یعنی مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کے) حالات سترھویں اور اٹھارھویں صدی عیسوی کے مذہبی تذکروں میں تفصیل سے درج ہیں مگر مآخذ ندارد۔ رہے ان کی بنیاد کشف پر ہے یا سُنی سُنائی روایات پر ہے۔ دونوں صورتوں

میں اعتماد کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔" واقعات کے علاوہ جو تاریخ فناتوں سے بنائی جاتی ہے تو درایت کے ذریعہ اس کی چھان بین اچھی طرح کر لی جاتی ہے مگر صابری تذکرہ نگاروں نے آنکھیں بند کر کے ہر رطب و یابس کو قبول کر لیا۔ پھر ان فضول روایتوں میں از راہ مشیخت خوب گل و بوٹے بھی لگائے۔ ان صاحبان کی تمام تر توجہ نسب۔ وطن اور کرامات پر رہی ہے۔ حالانکہ روحانیت میں ان اُمور کی کوئی وقعت ہی نہیں۔ اور کمال یہ ہے کہ پھر بھی نسب و وطن کے متعلق فیصلہ نہ کر پائے۔ انہوں نے کرامات کو طلسمات کا ہم پلہ بنا دیا ہے جب مباحث نے طوالت اختیار کی تو معاندین کا مُنہ بند کرنے کے لیے قہر و غضب کی کہانیاں ایجاد کر لیں اور نہ سمجھے کہ یہ خیالی و جلالی داستانیں شریعت و طریقت کے خلاف ہونے کی وجہ سے اور بھی رسوائی کا باعث ہونگی طوفان نوح۔ فرعون کی غرقابی۔ اور قہر الٰہی کے دیگر واقعات بیشک صحیح ہیں۔ لیکن ان مواقع پر اللہ تعالیٰ نے قہر و جلال کا اظہار اس وقت کیا جب کہ اصلاح کی کوئی صُورت باقی نہیں رہی۔ ان تذکرہ نویسوں نے جس جلال کی نمائش کی ہے وہ مُجرد جلال ہے۔ اس میں اتمام حُجت کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی تنگ بندیوں کو بصُورت معتقدات پیش کر کے جن کرامات کا اندراج کیا ہے اس کی اصلیت و غایت سمجھنے کی ضرورت ہے۔ جن صاحبان کو نفسیات کا علم ہے وہ دیکھتے ہی سمجھ لیں گے کہ ان میں صداقت کتنی ہے اور راویوں کے قیاسات کا کتنا حصّہ ہے جو انانیت و باطل پرستی کی وجہ سے ہے۔ سب سے زیادہ پریشان کُن اور حیرت انگیز یہ حقیقت ہے کہ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے متعلق نہ صرف معاصر تاریخ خاموش ہے بلکہ ابتدائی چشتی تذکرے بھی انگشت بدنداں ہیں۔ معاندین اسی سبب سے خیال کرتے ہیں کہ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا وجود ہی نہیں تھا۔ مگر دیگر سلاسل کے بزرگوں نے ان کا ذکر خیر ادب و تعظیم سے

کیا ہے ان بزرگوں کے مختصر بیانات حضرت کے وجود اور ان کی مقبولیت کا بہترین ثبوت ہیں حضرت شاہ بو علی قلندر رحمۃ اللہ علیہ ان کے ہمعصر تھے۔ بعد والوں میں حضرت بہاء الدین نقشبند رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مظہر جانِ جاناں رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ہیں ان سب نے مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا اعتراف کیا ہے۔ حضرت خواجہ معصوم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی کتاب "سبع الاسرار فی مدارج الاخیار" میں لکھا ہے "واضح ہو کہ حضرت فرید الدین مسعود گنج شکر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے دو سلسلے ہیں۔ جو بواسطہ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ہے اس کو نظامیہ کہتے ہیں اور جو بواسطہ علی احمد صابر قدس سرہٗ ہے اسے صابریہ کہتے ہیں۔ صفحہ ۸۹ پر سلسلہ صابریہ کو مستند لکھا ہے اور اسی کو اپنے بیان میں مقدم بھی رکھا ہے۔" حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دو ملفوظات۔ اسرار الاولیاء اور راحت القلوب مشہور و معروف ہیں۔ اسرار الاولیاء کے جامع حضرت بدر الدین اسحاق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ہیں اور اس میں ۶۳۱ھ کے بعد والے حالات ہیں۔ راحت القلوب کے مرتب حضرت سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ بتائے جاتے ہیں۔ اس میں ۶۵۵ھ کے بعد والے اذکار ہیں۔ راحت القلوب کی حیثیت جو کچھ بھی ہو مگر سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ کا خود ارشاد ہے کہ میں نے کوئی کتاب نہیں لکھی ہے اسرار الاولیاء کو حضرت حمید قلندر رحمۃ اللہ علیہ حضرت گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ اور صاحب جواہر فریدی صحیح نہیں سمجھتے بہر حال ان دونوں ملفوظات میں حضرت مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ذکر برائے بیت بھی نہیں ہے۔

میر حسن علاء سجزی بدایونی[1] رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے حضرت سلطان المشائخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے ملفوظات، فوائد الفواد، کے نام سے جمع کئے تھے۔ اس کو حضرت سلطان جی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی نظر ثانی کی سعادت حاصل ہے۔ یہ کتاب ماہ شعبان ۷۰۷ھ میں لکھنا

---

[1] ان کا وصال دولت آباد میں، بسال ۱۳۳۸ء میں ہوا۔

شروع کی گئی تھی اور ۷۲۲ھ میں بہ عہد غیاث الدین تغلق ختم ہوئی۔ یعنی حضرت سلطان جی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے وصال سے تین سال پہلے اور مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کے وصال سے ۳۵ برس بعد اس میں بھی مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کا کوئی ذکر نہیں ہے "افضل الفوائد"، حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ۱۳ ذوالحجہ ۷۱۳ھ کو لکھنا شروع کی تھی۔ اس کے حصہ دوم کا آغاز ۷۱۹ھ میں ہوا تھا۔ لیکن خاتمہ کا سال نہیں معلوم۔ اس کو فرضی خیال کیا جاتا ہے بہر حال اس میں بھی مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا حال نہیں ہے۔

۷۵۶ھ میں فیروز شاہ کے زمانہ میں حضرت حمید قلندر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے حضرت چراغ دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے ملفوظات خیر المجالس، لکھے تھے۔ یہ بھی مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے ذکر سے خالی ہے۔ مختصر یہ کہ ان جملہ ملفوظات میں صرف مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ہی نہیں بلکہ بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اور بھی خلفاء کا ذکر نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ جامعان ملفوظات ان سب کے منکر ہیں۔ عدم ذکر کی وجہ سے عدم وجود کا شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ ذکر نہ ہونے کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ ان کی مجالس میں کسی نے نہ ان صاحبان کے متعلق استفسار کیا اور نہ ذکر کیا۔

سلطان ناصر الدین محمود کے عہد (۷۹۶-۸۰۱ھ) میں سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات ۷۹۷ھ کے قریب و جوار میں سید مبارک کرمانی عرف میر خورد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے "سیر الاولیاء" کے نام سے جمع کئے تھے[1] اس کتاب "سیر الاولیاء" کی اہمیت یوں بھی

---

[1] بقول خزینۃ الاصفیاء میر خورد کا انتقال ۷۷۰ھ میں ہوا تھا اس لیے سیر الاولیاء کا سال تصنیف ۷۹۷ھ نہیں ہو سکتا حضرت سلطان جی رحمۃ اللہ علیہ اور میر خورد رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال میں ۴۵ سال کا فصل ہے میر خورد کو ۷۵۸ھ میں بقول انکے خواب میں سلطان جی رحمۃ اللہ علیہ نے تجدید بیعت کی ہدایت کی تھی۔ لہٰذا سیر الاولیاء کا سال تصنیف ۷۶۰ھ اور ۷۷۰ھ کے وسط میں ہونا چاہیئے۔

ہے کہ کرمانی خاندان حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور حضرت سلطان جی رحمۃ اللہ علیہ دونوں کا منظورِ نظر تھا۔ میر خورد کے دادا سید محمود کرمانی ترک وطن کرکے اجودھن میں قیام پذیر ہو گئے تھے اور حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے وصال ۶۶۱ھ تک وہیں رہے[1] وہ ۶۴۳ھ میں اجودھن آئے تھے۔ گویا وہاں اٹھارہ سال کی سکونت ٹھہرتی ہے۔ ان کی اہلیہ بی بی رانی فریدی جماعت خانہ کے منتظمین میں سے تھیں[2] اور انہوں نے حضرت علاء الدین موج دریا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو دودھ بھی پلایا تھا۔ موج دریا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا سال پیدائش ۶۵۱ھ ہے میر خورد نے خود بھی لکھا ہے کہ میرے والد حضرت موج دریا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے رضاعی بھائی تھے حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد حضرت سلطان جی رحمۃ اللہ علیہ نے کرمانی خاندان کو اپنے پاس دہلی بلا لیا تھا۔ میر خورد کے دادا سید محمود کرمانی کا انتقال ۷۱۱ھ میں ہوا تھا[3]۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میر خورد کی پرورش۔ تربیت و تعلیم حضرت سلطان جی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے زیرِ سایہ ہوئی۔ ان کے نانا نے بچپن میں ہی انہیں سلطان جی کا مرید کروا دیا تھا۔ خود لکھتے ہیں کہ دریں ایام ورک معانی چنداں نہ بود۔ پھر اقرار کیا ہے کہ سلطان جی رحمۃ اللہ علیہ

---

[1] یہ سال وصال حضرت سلطان جی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کے مطابق ہے۔

[2] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اجودھن میں لنگر خانہ اسی زمانہ میں کھلا تھا۔

[3] سید محمود کرمانی کے چار صاحبزادے تھے۔ سید نور الدین کرمانی۔ سید کمال الدین امیر احمد کرمانی۔ سید قطب الدین حسن کرمانی ان تینوں کے مزار درگاہ سلطان جی میں چبوترہ یاراں میں ہیں۔ چوتھے صاحبزادے خاموش کرمانی تھے۔ ان کا انتقال دیوگیر میں ہوا تھا۔ سید نور الدین کرمانی کے تین صاحبزادے تھے۔ سید محمد کرمانی خلف اکبر تھے ان کا ہی عرف میر خورد ہے اور یہی سیر الاولیا کے جامع ہیں دوسرے صاحبزادے سید داؤد کرمانی تھے۔ اور تیسرے کا نام سید لقمان کرمانی تھا۔

کے وصال کے بعد، معاملۂ نفس کہ دشمن دینی است بر حسب مطلوب آنحضرت نہ بود اور نہایت ایمانداری سے وجہ بھی بتا دی ہے کہ "غلبہ جوانی چنانکہ افتد و دانی مزاحم شد" اس کے بعد لکھا ہے کہ ۶۵۰ھ میں حضرت محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کا شرف خواب۔ میں ہوا۔ چاہتا تھا کہ قدم لوں مگر کسانیکہ بودند مانع ایں دولت شدند۔ پھر دوبارہ خواب میں تجدید بیعت کا حکم ہوا اس وقت میری عمر پچاس سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ اب ہدایت و توفیق حاصل کر کے توبہ کی اور راہ راست اختیار کی۔ بعد میں حضرت چراغ دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے انہیں خلافت سے سرفراز فرمایا تھا۔ بچپن میں اپنے گھر والوں سے اور سلطان جی رحمۃ اللہ علیہ کی مجالس میں جو حالات دیکھے اور سنے تھے وُہی سیر الاولیاء میں درج کئے ہیں۔ عرصہ کے سنے ہوئے حالات میں سہو و نسیان کا دخل ہو سکتا ہے۔ پھر اس کتاب کی مختلف اشاعتوں میں بھی تحریفیں ہوئی ہیں۔ غرض مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ذکر اس کتاب میں بھی نہیں ہے۔ اپنے والد سے سُن کر جو روایت علی صابر ساکن ڈبکری کے متعلق سیر الاولیاء میں لکھی ہے اس کا اطلاق خدا جانے حضرت مخدوم علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ سے کیسے کر دیا گیا ہے۔ سب سے زیادہ یہ کہ سید محمود کرمانی حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے بھانجے مخدوم علی احمد صابر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ذکر اس مغایرت و اجنبیت سے نہیں کر سکتے تھے۔ نام کی کہیئے تو وہ علی صابر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تھا اور یہ علی احمد صابر ہیں۔ مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کی خلافت سے پہلے تک کے اکثر حالات و واقعات سید محمود کرمانی کی آنکھوں کے سامنے گزرے تھے۔ اگر یہ علی صابر بغیر از مخدوم علی احمد صابر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ہوتا تو میر خورد کو یہ ظاہر کرنے میں تکلف نہ ہوتا کہ اس علی صابر سے مراد مخدوم علی احمد صابر ہیں جو حضرت شیخ الشیوخ العالم کے بھانجے اور داماد تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ میر خورد کے والد نے اس دوسری شخصیت کو حضرت

مخدوم علی احمد صابر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پر منطبق ہی نہیں کیا ہے اب جو لوگ دونوں کو ایک سمجھتے ہیں ان میں یقیناً شئے لطیف کی کمی ہے۔

سیرالاولیاء میں دو تین روائتیں ایسی بھی ہیں جو روا روی میں بغیر سوچے سمجھے لکھ گئے ہیں۔ مثلاً لکھتے ہیں کہ بدرالدین اسحٰق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے جیتے جی از راہ ادب سلطان المشائخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کسی کو مرید نہیں کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ زلزال شدید میں مبتلا ہونے کی وجہ سے سلطان جی نے ۶۸۵ھ سے پہلے سلسلہ بیعت شروع نہیں کیا اور حضرت بدرالدین اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ کا وصال اس سال سے پہلے ہو چکا تھا۔[1] اب اگر ان کا وصال ۶۸۵ھ کے بعد ہوا ہے تو سلطان جی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مرید کرنا شروع کر دیئے تھے۔ غرض یہ روایت سیرالاولیاء کی صحت کا درجہ نہیں رکھتی۔

میر خورد نے خود ایک روایت اپنے والد کے متعلق لکھی ہے۔ وہ بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ یعنی وہ شیخ کبیر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے وصال سے دو تین دن پہلے دہلی سے اجودھن پہنچے تھے۔ دیکھا کہ حجرے کے کواڑ بند ہیں اور باہر پس دیوار صاحبزادگان جانشینی کے متعلق جھگڑا کر رہے ہیں۔ انہوں نے حجرے کے اندر جانا چاہا تو صاحبزادگان نے اجازت نہیں دی۔ مگر کچھ دیر کے بعد آنکھ بچا کر وہ حجرے کے اندر پہنچ تو گئے۔ آہٹ پا کر شیخ کبیر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے آنکھیں کھولیں اور بڑی شفقت سے دریافت کیا کہ سید کب آئے۔ عرض کیا کہ ابھی حاضر ہوا ہوں۔ اس کے بعد سید محمود کرمانی نے پہلے دہلی کے علما و مشائخ کے سلام پیش کیے اور سب کے آخر میں سلطان جی

---

[1] ان کے سالِ وصال کے متعلق اختلاف ہے۔ ان کے مزار پر حضرت خواجہ حسن نظامی رحمۃ اللہ علیہ نے سال وصال ۶۹۲ھ کندہ کروایا ہے۔ انوار الفردوس میں سال وصال ۶۶۷ھ درج ہے اور میری تحقیق کے مطابق ان کا سال وصال ۶۹۰ھ ہے جس کی تشریح میں نے سوانح بابا فرید شکر گنج رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ میں کی ہے۔

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا سلام پہنچایا۔ نام سنتے ہی پوچھا وہ کیسے ہیں اور حکم دیا کہ یہ عصا۔ یہ مصلے اور یہ جامہ انہیں دے دینا۔ پھر فوراً ہی فرمایا کہ فی الحال یہ سب تبرکات بدرالدین اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ کے پاس امانت رکھ دو۔ جب ان عطیات کی خبر صاحبزادگان کو ہوئی تو انہوں نے سوء مزاجی کا اظہار فرمایا کیونکہ وہ سب انہیں سلطان جی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا خیر خواہ سمجھتے تھے اور خیال کیا کہ ان کی وجہ سے یہ عطیات دیئے گئے ہیں۔ اس پر سید محمود کرمانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے معذرت پیش کی کہ میں نے سفارش نہیں کی تھی۔ ان کا سلام بھی احتیاطاً سب سے آخر میں کہا تھا۔ اب یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ یہ سب نعمتیں انہیں عطا فرمائیں"۔ اگر یہ یہاں صحیح ہے تو سید صاحب کی ذہنیت و فراست کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ وقت بیعت ۶۵۶ھ میں پہلے ہی کلاہ چار تُرکی۔ عصا۔ خرقہ۔ چوبی نعلین اور دستار سلطان جی علیہ الرحمۃ کو مرحمت کر دی تھیں۔ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ صاحبزادگان نے بلا حُجّت متفقہ طور پر حضرت بدرالدین سلیمان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو سجادہ نشین منتخب کیا تھا اور حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے آخری وقت میں جانشینی کے متعلق جھگڑا کرنا اخلاق اور فطرت کے خلاف بھی تھا۔ جس کو عقل قبول نہیں کر سکتی۔ غرض اسی قسم کی خامیوں کی وجہ سے حضرت گیسو دراز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی رائے ہے کہ سوائے فوائد الفواد کے سلطان جی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے جتنے بھی تذکرے ہیں وہ سب نامعتبر ہیں۔ صوفی محمد جان مرادآبادی صابری نے اپنی کتاب "قولِ فیصل" میں لکھا ہے کہ ۱۸۸۱ء میں لالہ چرن جی لال ساکن غیاث پور نے اپنے مطبع سے سیرالاولیاء شائع کی تھی۔ اس کے دیباچہ میں لالہ صاحب نے بتایا ہے کہ یہ کتاب خالص حضرت مولانا فخر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے قلمی نسخہ سے نقل کروائی گئی ہے اس لیے اس کے معتبر ہونے میں شک نہیں کیا جا سکتا اور ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا ہے کہ جو سُقم کتاب کی اصل عبارت میں پایا اس کو بخوف تحریف

ویسے ہی نقل کر دیا۔ (معاذ اللہ) اس کے بعد یہ بھی تحریر ہے کہ بعد طبع کتاب جو مطالب دیگر مقامات سے ملے وہ علیحدہ طبع کرا کے شامل کتاب کر دیئے ہیں۔ (مگر حوالہ نہیں دیا ہے کہ وہ مطالب کہاں سے ملے) چند سال ہوئے مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم کی کتاب "نظام تعلیم و تربیت" شائع ہوئی ہے۔ مولانا میر خورد کے معترف و قدردان ہیں ان کے حوالوں سے اپنی کتاب کی عزّت بڑھائی ہے مگر حصہ دوم میں انہوں نے بھی سیر الاولیاء کی الحاقی روائتوں کی تکذیب کرتے ہوئے مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کے بیان میں لکھا ہے "معلوم ہوتا ہے کہ ان پر (یعنی میر خورد پر) سلطان المشائخ کا وہ پختہ چشتی رنگ نہیں چڑھا تھا۔ جو سلطان جی کے خلفاء و مریدین کی خاص شان ہے۔ اس لیے بعض مواقع میں ان کی تعبیریں حدود احتیاط سے متجاوز نظر آتی ہیں۔ یعنی بابا فرید شکر گنج رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے دوسرے خلفاء خصوصاً سلسلہ صابری کے شیخ حضرت علی صابر[1] صاحب کلیر شریف کا ذکر کچھ ایسے انداز میں کیا ہے گویا ان کو بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے یہاں چنداں اہمیّت نہیں تھی۔ اگرچہ یہ الفاظ بھی لکھے ہیں کہ شیخ صابر درویشے قدم ثابت و نفس گیرا دوست ساکن ڈیکری بودے۔۔۔[2] اور بھوگا کا ترجمہ کیا ہے عیشے خوش خواہد گشت۔ مگر شیخ کا جو مقام ہے اس لحاظ سے اتنے الفاظ ناکافی خیال کیے جا سکتے ہیں۔" بہر حال ان فضول روائتوں سے مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہی فرضی روائتیں بناء فساد بن گئی ہیں۔

مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے وصال سے تقریباً ڈیڑھ سو سال اور

---

[1] صابر کلیر کا نام علی احمد صابر ہے نہ کہ علی صابر۔

[2] مولانا کو اشتباہ ہو گیا۔ بیان کردہ تعریف ڈیکری والے علی صابر کی ہے۔ مخدوم علی احمد صابر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پر منطبق نہیں ہو سکتی۔

سیر الاولیاء کے وجود میں آنے کے تیس بتیس سال بعد حضرت شیخ احمد اشرف یحییٰ منیری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے ملفوظات لطائف اشرفی کے نام سے زیر ترتیب تھے۔ اس کے صفحہ ۳۶۷ پر مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا تعارف اس طرح ہے کہ "حضرت قطب المشائخ شیخ علی احمد صابر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ از کُمّل خلفائے شیخ کبیر اند"۔ ثابت ہوا کہ حضرت کا نام نامی مشہور نام تھا اور ان کا ذکر ادب سے کیا جاتا تھا۔ اگر ان کے متعلق یہ فروعی روائتیں اس وقت سیر الاولیاء میں درج ہوتیں تو "لطائف اشرفی" میں ان کے متعلق کچھ نہ کچھ تو اشارہ ہوتا۔ نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ یہ تحریفیں بعد کی ہیں۔

سیر العارفین مولانا جمالی ہانسوی سہروردی کی مشہور و معروف تصنیف ہے اس میں بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے خلیفہ علی بہاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تک کا ذکر ہے مگر نہیں ہے تو حضرت مخدوم علیہ الرحمۃ کا۔ ان کا ذکر ایسے وقت میں حذف کیا گیا ہے جبکہ مولانا جمالی کے ہمعصر شیخ عبد القدوس گنگوہی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نہایت آب و تاب سے سلسلہ صابری کی اشاعت فرما رہے تھے اور جناب جمالی سلسلہ صابری کی ترقی و مقبولیت بچشم خود دیکھ رہے تھے اس چشم پوشی کا سبب وہ اختلاف ہو سکتا ہے جو اس زمانہ میں چشتیوں اور سہروردیوں میں ہو گیا تھا۔ یا پھر اس کی وجہ حضرت جمالی کی ذاتی پُرخاش بھی ہو سکتی ہے۔ جمالی سکندر لودھی کے مشیر خاص تھے۔ ابراہیم لودھی سے اختلاف ہو جانے پر وہ بادشاہ ہمایوں کے یہاں آگئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے سیر العارفین ہمایوں ہی کے نام مُعَنوَن کی ہے۔ مگر شیخ عبد القدوس کے سامنے ان کا چراغ نہ جل سکا۔ کیونکہ ہمایوں شیخ عبد القدوس کا معتقد یا بقول ابو الفضل مرید تھا۔ مولانا جمالی[1] کا انتقال ۹۴۲ھ میں ہوا اور حضرت شیخ عبد القدوس نے ۹۴۴ھ میں پردہ فرمایا۔

---

[1] جمالی حضرت جمال ہانسوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہموطن تھے۔ ممکن ہے کہ ان سے قرابت بھی ہو۔ اسلامی ممالک

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ۹۹۹ھ میں "اخبار الاخیار" لکھی تھی۔ اکبری دور کی یہ مستند کتاب ہے۔ محدث صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ان غلط روائتوں کی جو سیر الاولیاء میں صاحب کلیر کے متعلق ہیں سب سے پہلے تردید کی ہے۔ انہوں نے گرفت کی کہ "این شیخ علی صابر کہ داماد شیخ فریدالدین وخلیفہ اُو بود۔ قبر اُو در کلیر است و سلسلہ شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ وغیرہ بہ وے منتہی می شود و عجب کہ اُو در سیر الاولیاء اصلا نہ کردہ وترک ذکر او خالی از غرابت نیست" یہ آخری فقرہ ہی ٹیپ کا بند ہے۔ اس کے بعد از راہ احتیاط یہ بھی لکھ دیا ہے کہ "تواند کہ از شیخ علی صابر ہمیں شیخ صابر باشد" اس تواند سے ظاہر ہو رہا ہے کہ جو نسخہ سیر الاولیاء کا محدث صاحب کے پاس تھا اس میں علی صابر کا ساکن ڈیکری ہونا درج نہیں تھا۔ اگر ہوتا تو وہ تواند کا لفظ لکھ کر شبہ کا فائدہ نہ دیتے پھر یہ بھی قابل غور ہے کہ وہ شیخ علی صابر اور صابر میں امتیاز بھی کرتے ہیں۔ مزید برآں یہ بھی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ہانسی کے نزاع کا قصہ اخبار الاخیار کی تصنیف کے بعد کی ایجاد ہے۔ محدث صاحب رحمۃ اللہ علیہ ۹۹۶ھ میں حجاز گئے تھے اور ۱۰۰۰ھ میں واپس آئے تھے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اخبار الاخیار حجاز میں لکھی تھی۔ واللہ اعلم۔

اکبری عہد میں مذہبی اقدار کی نوعیت میں لودیوں کے عہد سے بھی زیادہ ابتذال ہو گیا تھا۔ ارتداد کی جگہ الحاد نے لے لی تھی۔ اور عملیات و جنتر منتر جزو ایمان بن گئے تھے۔ ایرانی جو ہمایوں کے ساتھ آئے تھے انہوں نے اپنے عقائد کی اشاعت زور شور سے کی۔ پھر اکبر کی تقویت پر ویدانتی۔ آتش پرست۔ زرتشتی۔ عیسائی اور دیگر مذاہب بھی انگڑائیاں

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) ان کے مرشد حضرت سماء الدین جید عالم تھے۔ ہندوستان واپس آ کر جمالی نے سیر العارفین مرتب کی تھی۔

لینے لگے۔ حتیٰ کہ درویشی کے معیار و تقدس میں بھی تبدیلی واقع ہو گئی۔ سینکڑوں مصنوعی صوفی وجود میں آ گئے اور طرح طرح کی شعبدہ بازیاں دکھانے لگے۔ مخالفین نے جب مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے متعلق نئی نئی خلاف آئین روائتیں تراشیں تو معتقدین نے اپنی آبرو رکھنے کے لیے ان ہرزہ سرائیوں کو حسب مراد بنا لیا۔ چنانچہ اکبری عہد میں ایک صوفی مرزا لعل بیگ تھے "ثمرات القدس" ان کی تصنیف ہے[1] جو ۱۰۰۹ھ (۱۰۱۷) میں لکھی گئی تھی[2] انہوں نے نہایت وثوق سے سیر الاولیاء کے نامعلوم الاسم مرید کی الحاقی روایت کو صحیح سمجھا۔ پھر یہ بھی تسلیم کر لیا کہ حضرت جمال ہانسوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو سندوں کے رد و قبول کا اختیار تھا (صفحہ ۳۵)۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے متعلق ایک انوکھی اور اچھوتی روایت لکھ ڈالی ہے کہ "بعضے علماء در رسائل خود وے را خواہر زادہ گنج شکر قدس سرہ نوشتہ اند جمعے دیگر گویند کہ صابر مردے بود کہ ہمشیرہ شیخ الاسلام در حبالہ عقد وے بود۔ از وے فرزند علی صابر نام تولد شد کہ الحال اکثر عزیزان چشتیہ علیہم اللہ تعالیٰ بہ وے استناد دارند۔ علی بتوکل تقدیریں مردے بود صاحب سُنیّہ و عادات فاخرہ و مستجاب الدعوات۔۔۔ خواست کہ عالم را اسیرے نماید۔ از گنج شکر التماس رخصت کرد۔ مرخص نمود۔ در ہنگام وداع فرمود کہ اے علی صابر اُمید دارم کہ تمام عمر خوش وقت باشی۔ گویند کہ تا زیست اوقات وے بہ خوشی وخرمی بگذشت (صفحہ ۲۱۸)" معلوم ہوتا ہے کہ ان صوفی صاحب کی روحانیت اس درجہ بلند تھی کہ اُن کی عقل شریف شرمندہ ہو کر تحت الثریٰ میں جا چھپی تھی۔ انہوں نے

[1] اس کا قلمی نسخہ شرقپور ضلع شیخوپورہ پنجاب میں صاحبزادہ نصرت نوشاہی کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس کی عبارت ژولیدہ ہے۔

[2] ماخوذ از تذکرہ علمائے ہند۔ تالیف مولوی رحمان علی صاحب۔

بڑی خوبی سے سیرالاولیا کی مختلف غیر متعلق روایتوں میں ربط پیدا کر کے اپنے باطنی علم سے ایک نئے وجود کی تخلیق کر دی ہے اور اپنی ذاتی تحقیق سے نسب و ولدیت کے متعلق بھی حیرت انگیز انکشاف کیا ہے۔ حضرت عبدالقدوس رحمۃ اللہ علیہ کی شاندار تعلیم و تبلیغ کے باوجود یہاں کی فضا گندگی سے نہیں بچ سکی۔ اب اس کا کیا علاج کہ آج بھی بعض لوگ اپنی تنگ ذہنیت کی وجہ سے اکبری دور کے صوفیائے خام و اشرار کو حضرت عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ہی تعلیم کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور اپنی تاریخ دانی پر فخر کرتے ہیں[1]۔ ثمرات القدس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو اسناد کے ردّ و قبول کا اختیار حاصل تھا مگر انہوں نے ابھی تک استعمال نہیں کیا تھا کیونکہ نزاع ہانسی کا معرکہ ابھی تک وجود میں نہیں آیا تھا۔ اگر اس مفروضہ نزاع کی ذرا بھی خبر مرزا صاحب کو ہو جاتی تو خدا جانے کیسی کیسی گُل افشانی فرماتے ان کے بیان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ابھی تک علی صابر کو ساکن ڈیکری بھی قرار نہیں دیا گیا تھا۔

میر عبدالواحد بلگرامی اکبر عہد کے نامی گرامی علماء میں سے ہیں۔ سلسلہ نظامیہ کی خلافت انہیں حاصل تھی۔ ان کی وفات جہانگیر کے عہد میں ۱۰۱۷ھ میں ہوئی تھی۔ وفات سے پہلے ۱۰۱۶ھ میں "سبع سنابل" تصنیف کی تھی۔ یہ مشہور و معروف کتاب ہے مگر اغلاط سے خالی نہیں ہے۔ لکھا ہے کہ "شیخ جمال بزرگ تر بودند۔ روزے شیخ فرید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ خواہرزادہ خود را کہ شیخ علی صابر نام داشت خلافت عطا کردہ بر شیخ جمال فرستاد۔ چوں پیش جمال رسید شیخ جمال جامۂ خلافت از ایشاں باز گرفتند کہ شما لیاقت ایں جامہ نہ دارید۔ آں خواہرزادہ بر مخدوم شیخ فرید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ آمد۔ ماجرا گفت۔ مخدوم

[1] ملاحظہ ہو کتاب "دینِ الٰہی اور اس کا پس منظر" پروفیسر محمد اسلم مؤلفہ۔

فریدالدین فرمود کہ شیخ جمال از ہر کہ جامہ خلافت بستانہ فرید اورا دادن نتواند"۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ نزاع ہانسی جہانگیر کے ابتدائی عہد میں ہوا تھا۔ میر صاحب نے جامہ خلافت چھین لینے کی وجہ نہیں بتائی ہے اور سخت حیرت ہے کہ آئین طریقت سے واقفیت رکھتے ہوئے کیسے لکھ دیا کہ مرشد اپنے خلیفہ کو ایسا اختیار دے سکتا ہے اور خلیفہ مرشد کی عطا کردہ سند کو مسترد کر سکتا ہے اس کے علاوہ یہ بھی حقیقت ہے کہ حضرت جمال کو بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خواہرزادے علی احمد صابر سے شروع سے ہی دلچسپی تھی جبکہ آٹھ برس کی عمر میں وہ اجودھن لائے گئے تھے اور حضرت جمال مدارج حاصل کر رہے تھے۔ غالباً علی صابر ساکن ڈیکری سے میر صاحب ناواقف تھے ورنہ اس کے متعلق سکوت اختیار نہ کرتے۔ ناممکن ہے کہ انہوں نے سیرالاولیاء میں نامعلوم الاسم مرید کا قصہ نہ پڑھا ہو اور اخبار الاخیار میں محدث صاحب کی رائے علی صابر کے متعلق نہ دیکھی ہو۔

شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے حضرت شیخ العالم احمد عبدالحق ردولوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی کرامتیں "انوار العیون" میں جمع کی ہیں۔ ان کی معلومات معتبر ہیں۔ ان کرامتوں سے حضرت شیخ العالم کی کیفیات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور جن مقامات میں ان کا ظہور و صدور رہا ہے وہاں کے اس وقت کے حالات کا بھی پتہ چل جاتا ہے اگر ایک دو کرامتیں ناقابلِ فہم ہیں تو ان میں ظن و تخمین کا دخل نہیں ہے بلکہ معتبر راویوں کا مبالغہ سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ اُردو میں "درِ مکنون" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ کرامتیں اگرچہ شرطِ ولایت نہیں۔ مگر درویشوں اور خصوصاً مجذوب سالکوں کے حالات میں سوائے کرامتوں کے اور ہو بھی کیا سکتا ہے کیونکہ یہ صاحبانِ ظاہری رسوم کے پابند نہیں ہوتے۔ اور تکلف و نمائش سے بری ہوتے ہیں۔ شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نے حضرت شیخ العالم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے وصال کے چالیس سال بعد ان کی روحانیت سے فیض حاصل کر کے ان کے پوتے اور حضرت عارف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے صاحبزادے حضرت شیخ محمد سے خلافت پائی تھی۔ ان کی یہ تصنیف مثالی ہے مگر افسوس کہ بعد والوں نے ان کے طرز کا اتباع نہیں کیا۔

سلسلۂ صابری کی تجدید کے بعد مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا پہلا تذکرہ "گلزار ابرار" خیال کیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے فرشتہ (متوفی سنہ ۱۰۲۳ھ) نے اپنی تاریخ میں حضرت مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا کچھ ذکر کیا ہے گلزار ابرار مولانا محمد غوثی شطاری کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ یہ صاحب بمقام مانڈو سنہ ۹۶۳ھ میں پیدا ہوئے تھے اور سید محمد غوث گوالیاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (متوفی سنہ ۹۷۰ھ) کے مرید تھے سنہ ۹۹۵ھ میں حجاز جاتے ہوئے محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کچھ دن مانڈو میں قیام کیا تھا۔ اسی وقت محمد غوثی کو ان سے نیاز حاصل ہوا تھا۔ گلزار ابرار میں خود لکھا ہے کہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے بہت کچھ فیروزی و فرخندگی کے فوائد حاصل کئے تھے۔ گلزار ابرار کا سال تصنیف سنہ ۱۰۲۲ھ ہے گویا یہ جہانگیر کے عہد میں لکھی گئی تھی فرشتہ اور محمد غوثی کی کارگزاری یہ ہے کہ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو روشناس کرایا اور شیخ عبد القدوس رحمۃ اللہ علیہ کا کارنامہ یہ ہے کہ شیخ العالم کے جدید طرز کا تعارف کیا۔ شیخ عبد القدوس رحمۃ اللہ علیہ نے امراء و سلاطین سے روابط و ضوابط کو جائز رکھا تھا حالانکہ متقدمین چشتیہ کا یہ دستور نہیں تھا، لہذا محمد غوثی پر اس وجہ سے اعتراض کئے جاتے تھے ان اعتراضوں کی تردید انہوں نے بھرپور کی ہے مگر اصل یہ ہے کہ شیخ عبد القدوس رحمۃ اللہ علیہ نے امراء و سلاطین سے تعلقات رکھنے میں ضرورتِ زمانہ کے بموجب حضرت شیخ العالم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی تقلید کی ہے۔

گلزار ابرار میں ہانسی کے نزاع کا ذکر موجود ہے یہ مزید ثبوت ہے کہ ہانسی

کے نزاع کی داستان جہانگیر کے عہد میں تراشی گئی تھی۔ اس سے پہلے اس کا وجود نہ تھا۔ شیخ علی اصغر فریدی چشتی کی کتاب "جواہر فریدی" مشہور ہے۔ یہ کتاب پاک پٹن شریف کے قیام میں وہاں کے بزرگوں سے حالات معلوم کر کے لکھی تھی اور ان کا ماخذ وہاں کا مشہور تذکرہ "گلشن اولیاء" بھی تھا جواہر فریدی کی بعض روایتیں مشکوک ہیں۔ اس میں شجرہ درج نہیں ہے۔ صفحہ ۳۰۵ اور بزرگوں کے عرسوں کی فہرست میں مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے عرس کی تاریخ درج نہیں ہے۔ گویا اس وقت حضرت کا عرس شروع نہیں ہوا تھا۔ (صفحہ ۲۳۳) ہزبرہ خاتون کے بطن سے تین صاحبزادیوں کے نام لکھے ہیں۔ بی بی فاطمہ۔ بی بی مستورہ اور بی بی شریفہ (صفحہ ۳۰۲) صفحہ ۳۸۹ پر بحوالہ سیر الاولیاء لکھا ہے کہ بی بی مستورہ کے شوہر عمر صوفی تھے۔ بی بی فاطمہ کو اہلیہ بدر الدین اسحاق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ درج کیا ہے۔ بی بی شریفہ کے متعلق بتایا ہے کہ جوانی میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ پھر معلوم نہیں کس طرح صفحہ ۳۹۶ پر رقمطراز ہیں کہ ان کا عقد مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے ہوا تھا۔ ان کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ غرض یہ حضرت بی بی شریفہ کے متعلق گول مول ہو کر رہ گئے ہیں۔

سیر الاقطاب شیخ اللہ دیا کیرانوی چشتی کی معرکۃ الآراء تصنیف ہے۔ فراست و ذہانت اور طلسمات کا نایاب شاہکار ہے یہ واحد و شاید کتاب سنہ ۱۰۳۶ھ کی تصنیف ہے۔ تاریخ مشائخ چشت میں پروفیسر خلیق نظامی صاحب نے بھی اسی سال تصنیف کی تصدیق کی ہے مگر خود اللہ دیا کیرانوی چشتی نے اس کے خاتمہ میں اپنی اس تصنیف کا سال سنہ ۱۰۵۶ھ تحریر فرمایا ہے۔ گویا یہ شاہجہان کے عہد میں لکھی گئی تھی۔ اور یہ بھی بتایا ہے کہ اس کتاب کی نسبت حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے خواب میں پسندیدگی کا اظہار کیا تھا اور عالم اسباب میں شاہجہان بادشاہ نے شرف قبولیت بخشا تھا۔ شاہجہان کی خدمت میں یہ کتاب اس وقت پیش کی گئی تھی جب وہ کابل کو جا رہے تھے۔ لہذا کتاب کے ساتھ مصنف کو بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے شاہجہان نے کابل کا سفر تین مرتبہ کیا

ہے۔ پہلی مرتبہ ۱۰۴۸ھ میں دوسری مرتبہ ۱۰۵۵ھ میں اور تیسری مرتبہ ۱۰۵۸ھ میں۔ اس کے علاوہ کیرانوی نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ "اندریں ایامِ تصنیف در ۱۰۶۹ھ در عین راہے اجمیر شریف بودم"۔ اگر سال تصنیف ۱۰۶۹ھ ہے تو سفر کابل کی روایت محض خیالی اور غلط ٹھہرتی ہے۔ اور اگر سال تصنیف ۱۰۳۶ھ ہے تو طے نہیں کیا جا سکتا کہ بادشاہ ان کو اپنے کونسے سفر میں ہمراہ لے گئے تھے۔ اور اگر یہ کتاب ۱۰۵۶ھ میں طیار ہوئی تھی تو قیاس کیا جا سکتا ہے کہ تیسرے سفر کابل میں بہ سال ۱۰۵۸ھ کیرانوی صاحب کو شاہجہان نے ہمرکابی کی عزت بخشی تھی واللہ اعلم۔ سفر کابل اور وہاں کے قیام کی روئداد از قسم کرامت ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک شام کو بادشاہ جھیل کے کنارے اس کتاب کا مطالعہ فرما رہے تھے عصر کی نماز کو اٹھے تو کتاب وہیں چھوڑ گئے۔ واپس آ کر دیکھا تو کتاب غائب تھی ہر چند تلاش کی مگر نہیں ملی۔ دوسرے دن اس کتاب کی جلد کے پشتے جھیل میں شناوری کر رہے تھے۔ جب جھیل کی تہ سے کتاب نکالی گئی تو سب حاضرین نے ملاحظہ کیا کہ رات بھر کے غسل کے بعد کتاب کے صرف حاشیوں پر پانی نے اثر کیا تھا۔ اور کاغذ و روشنائی پر پانی کا برائے نام بھی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس کتاب میں ہانسی کے نزاع کی داستان شاعرانہ انداز میں لکھی ہے یعنی مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی سند پہ مہر لگوانے مجمع کثیر کے ساتھ پالکی میں بیٹھ کر وہاں گئے تھے۔ خانقاہ کے دروازہ پر حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے شاندار استقبال کیا تھا مگر مخدوم بغیر ادھر اُدھر دیکھے ہوئے بے نیازی کے ساتھ سیدھے مسند پہ جا کر جلوہ افروز ہو گئے۔ بعد مغرب سند پر مہر لگانے پر اصرار کیا تو مجبوراً حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے چراغ منگوایا۔ مگر وہ ہوا سے گُل ہو گیا۔ اسی وقت مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنے دمِ آتشین سے یا اپنی انگشت مبارک کو جلا کر چراغ روشن کر دیا یہ دیکھ کر حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ میں بھی حرارت پیدا ہو گئی

اور سند چاک کر کے فرمایا تم خلافت کے لائق نہیں ہو۔ اور دہلی تمہارے جلال کی تاب نہیں لا سکے گی اس پر مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے بھی اظہار جلال کیا اور فرمایا تم نے میری سند چاک کی ہے تو میں نے بھی تمہارا سلسلہ منقطع کر دیا۔ حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے گھبرا کر ڈرتے ڈرتے پوچھا کہ میرا سلسلہ کس طرف سے قطع کیا ہے۔ جلالی شان سے جواب دیا گیا "اوپر سے" اُدھر اجودھن میں بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پریشان تھے کہ آپس میں دو شیر جُٹ گئے ہیں خدا خیر کرے۔ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اجودھن پہنچ کر ماجرا بیان کیا۔ تو حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا تیر مرداں خطا نمی شود۔ یہ بتاؤ سلسلہ جمال کا کس طرف سے تم نے چاک کیا ہے عرض کیا کہ اُوپر سے۔ یہ سُن کر شیخ کبیر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے شکر ادا کیا کہ آخر تو سلامت رہا۔[1] اس کے بعد تسلی دی کہ جمال کے پھاڑے ہُوئے کو اگرچہ میں جوڑ نہیں سکتا۔ لیکن اپنے ہاتھ سے لکھ کر تمہیں کلیر کی ولایت لکھ دوں گا"۔ اس مفروضہ جواب سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مخدوم کی ولایت دہلی کا پروانہ چاک کیا تھا۔ اور سند خلافت سلامت رہی تھی۔ جب بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مخدوم کو کلیر رخصت کیا تو فرمایا کہ لوحِ محفوظ میں مستور ہے کہ تمہارا ایک خلیفہ جمال کے سلسلہ کو جاری کرنے کی دعا کرے گا تو دعا قبول ہوگی لہٰذا تم بھی اپنی زبان سے کہہ دو کہ جمال کا سلسلہ جاری ہو جائے۔ حکمِ حاکم مرگِ مفاجات۔ اس لیے بادل ناخواستہ کہنا ہی پڑا۔

شیخ اللہ دیا کیرانوی چشتی نے حضرت کبیر الاولیاء کے احوال میں لکھا ہے کہ جب وہ ہانسی پہنچے تو حضرت جمال نے نہایت ندامت سے گذارش کی کہ میرے

---

[1] آخر تھا ہی کب کہ سلامت رہتا۔ البتہ شیخ کبیر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی (عیاذ باللہ) نسبت جاتی رہی۔

سلسلہ کے اجرا کے لیے دعا فرما دیجئے۔ چنانچہ انہوں نے دعا کر دی۔ قبولیت کا نتیجہ یہ ہے کہ حضرت جمال کے پَر پوتے حضرت نورالدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو ۷۰۰ھ میں حضرت سلطان المشائخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنے سلسلۂ نظامی کی خلافت سے سرفراز فرما دیا۔ یہ جمالی نہیں ہوئے بلکہ نظامی سلسلہ سے منسلک ہوتے اور اپنے شجرہ میں اپنے نام سے پہلے حضرت سلطان المشائخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا اسم گرامی لکھا کرتے تھے[۱] اللہ دیا صاحب کا انکشاف ہے کہ سلسلہ اگرچہ جاری ہو گیا مگر مقبول نہیں ہوا اس لیے کہ بابا صاحب علیہ الرحمۃ کے حکم سے اس کے جاری کئے جانے کے متعلق مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کہہ تو دیا تھا مگر صاف دِل سے نہیں کہا تھا[۲] حضرت کبیر الاولیاء کی دعا کا اثر بھی قابلِ غور ہے یعنی حضرت جمال کے وصال کے بعد بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اُن کے چھ مہینے کے صاحبزادے صُوفی برہان الدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو بچپن ہی میں مرید کر کے خلافت عطا کر دی تھی پھر صوفی برہان الدین کا وصال ۶۹۹ھ میں ہوا اُسی سال ان کے صاحبزادے حضرت قطب الدین مُنوّر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پیدا ہوئے۔ آٹھ سال کی عمر میں حضرت سلطان المشائخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے انہیں خلافت عطا فرمائی۔ اور اسی دن حضرت چراغ دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو بھی خلافت سے نوازا تھا[۳]۔ قطب الدین منور رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا وصال ۷۶۰ھ میں ہوا تھا۔ ان کے صاحبزادے نورالدین رحمۃ اللہ علیہ

---

۱ سیر الاقطاب صفحہ نمبر ۲۰۲ سطر ۲۱

۲ سیر الاقطاب صفحہ ۱۸۱ سطر ۱۲

۳ حضرت چراغ دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پہلی مرتبہ ۷۱۸ھ میں دہلی آئے تھے۔ ان کی سند پہ تاریخ ۷۳۲ھ لکھی ہے لہٰذا ایک ساتھ خلافت ملنے کی روایت صحیح نہیں ہو سکتی (ماخوذ از بزم صوفیہ مرتبہ صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب۔

کو چھ مہینے کی عمر میں سلطان المشائخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی خلافت دی تھی۔ ان حقائق کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رہے کہ حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا وصال ۶۵۹ھ میں ہوا تھا۔ اور حضرت کبیر الاولیاء رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو حضرت ترک پانی پتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے خلافت ۷۱۲ھ میں ملی تھی لہٰذا حضرت جمال اور کبیر الاولیاء کی ملاقات بعید از قیاس ہے۔ سیر الاقطاب کے مطابق کبیر الاولیاء چالیس سال کی سیاحت کے بعد پانی پت آئے تھے۔ اور مرشد کی تلاش میں سرگرداں تھے اسی سلسلہ میں ان کا گذر ہانسی میں ہوا تھا۔ کبیر الاولیاء کے وصال کی تاریخ ۷۶۵ھ لکھی ہے اور ان کی عمر ایک سو بہتر برس کی بتائی ہے[۱]۔ اسی موقع پر حضرت جمال نے ان سے اجرائے سلسلہ کی درخواست کی تھی۔ اگرچہ اس وقت کبیر الاولیاء درجہ کمال کو نہیں پہنچے تھے۔ دعا کرنے کے بعد انہوں نے تلاش مرشد کے لیے سفر جاری رکھنا چاہا۔ تو حضرت جمال رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں ہدایت کی کہ پانی پت واپس جائیں وہیں مُرشد ملے گا[۲]۔ چنانچہ وہ بالآخر ۶۵۸ھ میں پانی پت واپس چلے گئے۔ حضرت مخدوم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی تجہیز و تدفین کرنے کے بعد ترک پانی پتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ۶۷۹ھ میں وطن واپس آئے تھے۔ عرصہ دراز کے بعد کبیر الاولیاء کی رسائی ان کی خدمت میں ہوئی تھی۔ پھر انہوں نے اپنے وصال سے تین سال پہلے کبیر الاولیاء کو خلافت ۷۱۲ھ میں دی تھی۔ ان واقعات سے جو نتیجہ نکلتا ہے اس کو تسلیم کر لینا ہر عامی کا کام نہیں۔ سلسلہ جمالی کا منقطع ہو جانا پھر کبیر الاولیاء کی دعا سے جاری ہونا جب کہ کبیر الاولیاء کو خلافت نہیں ملی تھی۔ اور کمال کو نہیں پہنچے تھے ایک کرامت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی کو خلافت نہ دے سکنے کی وجہ سے حضرت جمال کا سلسلہ چلا ہی نہیں اب سوال یہ ہے کہ ایک معدوم شے کو مخدوم صاحب

---

۱ سیر الاقطاب صفحہ نمبر ۲۰۲ سطر ۱۸۔

۲ سیر الاقطاب صفحہ ۲۰۳ سطر ۱۹۔

نے منقطع کیسے کر دیا بالفرض منقطع کر دیا تو اوپر سے منقطع کیا تھا لہٰذا مطلب یہی ہوا کہ حضرت جمال کو حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے جو خلافت دی تھی اس کو منقطع کیا اندریں حالات ان بیانات کو وہی مان سکتے ہیں جن کو شیخ اللہ دیا جیسی عقل ملی ہے۔ سلسلہ جمالی کی داستان جو کیرانوی صاحب نے سنائی ہے اس کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ آفریں باد بریں ہمت مردانۂ اُو۔ اس کے شکریہ میں جمالی حضرات کا فرض عین ہے کہ دھوم دھام سے کیرانوی صاحب کا عرس کیا کریں۔

جناب کیرانوی صاحب اس نتیجہ پر بھی پہنچے ہیں کہ ہانسی کے نزاع کی وجہ سے چونکہ حضرت جمال کو (عیاذ باللہ) عناد تھا اس لیے حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے ملفوظات میں مخدوم پاک کا ذکر انہوں نے لکھنے نہیں دیا۔ واقعی بڑی دور کی کوڑی لائے۔ مادیت اور روحانیت دونوں دنگ ہو کر رہ گئیں۔ کیرانوی صاحب کے علم میں یہ بھی ہے کہ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کلیر میں عتاب کرنے کی اجازت پہلے ہی بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کر لی تھی۔ لیکن جب ان کے جلال و عتاب کی خبر بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کو ملی تو ہاتھ مل کر رہ گئے۔ اور فرمایا کہ "آں ملک مع مضافات بہ تصرف اوست ہر چہ داند بہ کند۔ مختار است"۔ کیرانوی صاحب کے علم میں یہ بھی تھا کہ مخدوم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور حضرت سلطان المشائخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ میں گہرے تعلقات تھے۔ جب دہلی سے کوئی آتا تو مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ دل کھول کر تواضع فرماتے تھے۔ جب ان کے استغراق میں ایک بارات کا باجا رخنہ انداز ہوا تو اس بارات کو انہوں نے جنگل میں محبوس کر دیا لیکن جب سلطان المشائخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے سفارش فرمائی تو بارات کو قید سے رہائی دی۔ ان مراسم و روابط کا سلطان المشائخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے ملفوظات

میں برائے نام بھی ذکر نہیں ہے۔ تاریخی حالات اور ان دونوں بزرگوں کے واقعات سے ثابت ہے کہ ملاقات تو بطرف ان میں ظاہری دید و شُنید بھی نہیں تھی۔ کیرانوی صاحب نے ایک عجیب راز کا انکشاف کیا ہے۔ وہ یہ کہ حضرت بہاءالدین زکریا رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ پر فریفتہ ہو گئے تھے اور انہوں نے بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ سے استدعا کی تھی کہ میرے سب مرید لے لیجئے اور جمال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو مجھے دے دیجئے۔ انہیں جواب یہ دیا گیا کہ تبادلہ مال میں ہوتا ہے جمال میں نہیں ہوا کرتا۔ اس سوکھے جواب پر حضرت زکریا رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ نے "شیخ جمال را بہ جذب باطن سوئے خود کشید"۔ لہٰذا حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے بار بار ملتان جانے کی اجازت مانگا کرتے تھے۔ اکتا کر اجازت دی کہ "برو وادیٔ خود سیاہ کُن"۔ نقلِ کفر کُفر نہ باشد بقول کیرانوی صاحب حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا روئے جمیل اسی وقت سیاہ ہو گیا۔ اور وہ عرصہ تک جنگلوں میں گریہ وزاری کرتے رہے۔ آخر کار ایک تاجر مسمی عالم نے سفارش کی تو ذیل کی رُباعی بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے لکھوا کر حضرت کو بھجوا دی۔

رَد کرہ دجہان بگرد وپا آبلہ کُن	گر ہمچوں منے یابی مارا بلہ کُن
یک صبح بہ اخلاص بیا بر درِما	گر کار تو بر نہ آید۔ گلہ کُن

یہ رباعی نہ بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ہے نہ ان کے کسی ہمعصر کی ہے دراصل یہ رباعی بہاءالدین نقشبند کی ہے جو بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے وصال کے پچاس سال بعد لکھی گئی تھی۔ یہ روایت کیرانوی صاحب نے شاید یوں لکھی ہے کہ ہانسی والے نزاع کا انہیں حضرت جمال سے انتقام لینا تھا۔ مگر انہیں خیال نہیں رہا کہ اس روایت سے سہروردی حضرات بُرا مانیں گے۔

صاحب سبع الاقطاب کی نظر بہت بلند تھی وہ آسمان سے تارے توڑ لاتے تھے اور لوحِ محفوظ پر ہمیشہ نظر رکھتے تھے۔ انہیں جب علم ہوا کہ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بڑے پایہ کے شاعر ہیں تو ان کا دیوان حاصل کرنے کی ہر چند کوشش کی مگر نہیں مل سکا اور نہ لوح محفوظ پر اس کے متعلق کوئی تحریر تھی مگر قابل مبارکباد ہیں اور یہ ان کی خوش نصیبی ہے کہ انہیں فارسی کی ایک غزل مل سکی اور ایک اُردو کا شعر دستیاب ہوا۔ فارسی کی غزل وہ ہے جس کا مقطع ہے:۔

احمد بہشت و دوزخ بر عاشقاں حرام است

ہر دم رضاء جاناں رضوان شد است مارا

لیکن ظاہر ہے نقادوں کی رائے ہے کہ یہ غزل حضرت جامی کی ہے جو ۴۴۱ھ سے لیکر ۵۲۷ھ تک اس دنیا میں جلوہ افروز تھے۔ یہ توارد بذات خود کرامت ہے۔ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے زمانہ میں اردو زبان پاؤں بھی چلنے کے قابل نہیں تھی۔ ایسی ہندی نہ ہوگی جیسی حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کے ابتدائی کلام میں پائی جاتی ہے۔ اُردو کا ایک شعر مخدوم پاک کی روحانیت سے اس قدر صاف و ستھرا ہے جو تبرک کے طور پر کیرانوی صاحب نے نقل کیا ہے اور جس پہ آج کی ترقی یافتہ اُردو فخر کر سکتی ہے۔ ملاحظہ ہو

اس طرح اس میں ڈوب اے صابر

کہ بجز ہُو کے غیر ہُو نہ رہے

حضرت مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کا دیوان جو کیرانوی صاحب کو نہ مل سکا تھا۔ ابھی حال ہی میں وہ پاکستان کے زائرین کلیر شریف کے انگلستان پلٹ لیڈر کے ہاتھ آگیا اور انہوں نے معتقدین صابر صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے استفادہ کے لیے ”ارمغان صابر“ کے نام سے شائع کر کے احسان فرمایا ہے۔ عالی جناب ڈاکٹر وحید قریشی صاحب (لاہور)

نے کراچی کے سہ ماہی رسالہ ”اردو“ بابت اکتوبر ۱۹۶۷ء میں اس ”ارمغان صابر“ پر تبصرہ کر کے بڑی خوبی سے دیوان کے شائع کرنے والے پاکستان کے انگلستان پلٹ لیڈر صاحب کو مبارکباد اور داد دی ہے۔ انہوں نے اسی دیوان کے اشعار سے ثابت کر دکھایا ہے کہ یہ دیوان اس شخص کا ہے جس کا نام مظہر علی یا صابر علی تھا اور تخلص صابر رکھتا تھا۔ یہ صاحب دیوان سلسلہ نظامیہ سے منسلک تھا اس نے اپنے نظامی ہونے پر فخریہ اشعار بھی لکھے ہیں اور حضرت چراغ دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور حضرت قطب الدین منور رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی شان میں منقبتیں لکھی ہیں۔ کوئی سخن داں اور صاحبِ دانش اس دیوان کو حضرت مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے منسوب نہیں کر سکتا۔ غالباً یہ فیض اس انگلستان پلٹ لیڈر کو حضرت کیرانوی صاحب سے ہی پہنچا ہے۔ اگر دیوان شائع کرنے سے پہلے اس دیوان پر نظر ڈال لیتے تو دیباچہ میں وہ دعویٰ نہ کرتے جو کیا ہے۔ تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

کیرانوی صاحب کو ان کی تحقیق نے یہ بھی ثابت کیا کہ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو سماع کا بے حد شوق تھا اور صاحب مراۃ الاسرار نے ان کا بول بالا کیا ہے کہ حضرت مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا وصال بھی سماع کی حالت میں ہوا تھا۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ سماع ہی استغراق کا باعث ہوتا ہے اور یہ بھی غور طلب کہ سوختہ کلیر میں قوال کہاں سے مہیا ہو جاتے تھے۔ صوفی جانتے ہیں کہ حالتِ استغراق میں صوت سرمدی وجدانیت پیدا کرتی ہے۔ سچ پوچھیئے تو زمین سے آسمان اور قلب سے روح تک روحانی آواز ہی کی حکمرانی ہے۔ مولانا روم نے اس آواز کے متعلق لکھا ہے۔

خشک چوب و خشک تار و خشک پوست

از کجا می آید ایں آوازِ دوست

حضرت مخدوم علی ہجویری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ارشاد ہے کہ "سماع کی لذت اس وقت تک ہوتی ہے جب تک مشاہدہ نہ ہو۔ جب مشاہدہ ہو جاتا ہے تو سماع کی کوئی حقیقت نہیں رہتی" جب کیرانوی صاحب کی رُوح پر فتوح کی خدمت میں یہی عرض کیا جا سکتا ہے۔

اے تو مجموعۂ خوبی زکدامت گویم

۱۰۴۹ھ میں دارا شکوہ نے سفینۃ الاولیاء تصنیف کی تھی۔ اس میں حضرت محب اللہ الٰہ آبادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے فیض حاصل کرنے کا اقبال کیا ہے اور شجرہ صابری بھی نقل کیا ہے۔

مراۃ الاسرار شیخ عبدالرحمن چشتی کی تالیف ہے۔ یہ ۱۰۶۵ھ کی مشہور کتاب ہے اس میں خصوصیت کے ساتھ لفظ "بھوگا" کی تشریح کی ہے یعنی یہ کہ بھوگا حیرت کا مترادف ہے لہٰذا تحیّر بذاتِ خود عیش و عشرت ہے اور یہ نعمتِ تحیّر مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو حاصل تھی۔ اس لحاظ وہ یقیناً خوش باش تھے۔ ان کی تحقیق ہے کہ بھوگا والی دعا بابا صاحب نے مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو ہی دی تھی نہ کہ علی صابر ساکن ڈیکری کو انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ جب مخدوم علیہ الرحمۃ مستقل طور پر گولر کی شاخ پکڑ کر کھڑے ہو گئے تو بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے انعام کا وعدہ کر کے ترک پانی پتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو روانہ کیا کہ کسی طرح انکو بٹھا دیں حضرت ترک خوش الحانی سے قرآنِ پاک کی تلاوت کرتے ہوئے پہنچے تو جلال صابری مغلوب ہو گیا اور ادباً وہ کھڑے سے بیٹھ گئے۔ اس صلہ میں حضرت ترک کو مخدوم کی خلافت ملی۔ لیکن خلافت ملنے کا سال ان صاحب نے نہیں لکھا ہے۔ شیخ عبدالرحمن نے کلیر کی مسجد ڈھانے کی تاریخ ۶۵۰ھ لکھی ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ مخدوم پاک کو پہلے دہلی کی ولایت دی گئی تھی پھر ہانسی کے نزاع کے بعد کلیر کی ولایت تفویض ہوئی تھی۔ یہ شیخ عبدالرحمن چشتی حضرت

شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے صاحبزادے شیخ حمید کے مرید تھے۔

اورنگ زیب کے عہد میں شیخ علی اصغر چشتی نے ۱۰۸۳ھ میں "مخزن مناقب چشت" شائع کی تھی۔ اس کے بعض مضامین معتبر نہیں خیال کئے جا سکتے۔ انہوں نے مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی سیادت کی تشریح کی ہے۔

معارج الولایت[۱] بھی اورنگ زیب کے عہد کی تصنیف ہے ۱۰۹۴ھ میں غلام معین الدین نے لکھی تھی۔ انہوں نے بھی مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی سیادت کے ثبوت بہم پہنچائے ہیں اور سیر الاقطاب کی بعض روایتوں کی لغویت ظاہر کی ہے۔

سلسلہ صابری کی تجدید کے تقریباً دو سو سال بعد دیگر بزرگوں کے احوال کے ساتھ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مفصل حالات "اقتباس الانوار"[۱] میں حضرت عارف باللہ مولانا اکرم شاہ براسوی نے جمع کئے ہیں۔ مولانا موصوف ظاہری و باطنی علوم کے جامع اور اپنے عہد کے قطب مشہور تھے۔ ان کی دوسری تصانیف بھی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ بزرگوں کے حالات لکھنے کے ساتھ مسائل تصوّف کی وضاحت بھی کی ہے۔ مسئلہ وحدت الوجود پر کامل عبور رکھتے تھے۔ خود لکھا ہے کہ اقتباس الانوار کے لکھنے کی فرمائش خواب میں حضور غوث پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور حضور خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کی تھی۔ مولانا حضرت سوندھا سفید ونی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (متوفی ۱۱۲۹ھ) کے خلیفہ تھے۔ ان کو خرقہ خلافت ۱۱۱۱ھ میں ملا تھا۔ مولانا کا سلسلہ ابھی تک پانی پت میں جاری ہے۔ مگر ان کے سجادہ نشین

۱؎ ممنون ہوں کہ جناب محمد اقبال مجددی لاہوری نے مجھے صحیح سال اس کتاب کی تصنیف کا بتایا کہ ۱۱۳۲ھ ہے اور یہ کہ یہ تذکرہ چار مہینہ کی محنت کے بعد دہلی میں لکھا گیا تھا۔

تقسیمِ ہند کے بعد پاکستان کو ہجرت کر گئے ہیں۔ مولانا اکرم شاہ براسوی نے روحانی طور پر حضرت مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے نہ صرف فیض حاصل کیا تھا ملاقات کا بھی شرف حاصل کیا تھا۔ اب تک مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے متعلق جو اختلافی و نزاعی امور تھے۔ انہوں نے بڑی سادگی و صفائی کے ساتھ طے کر دیئے ہیں۔ انہوں نے فیصلہ فرمایا ہے کہ سیر الاولیاء کے علی صابر ساکن ڈیکری اور مخدوم علاء الدین علی احمد صابر دو نہیں بلکہ ایک ہی ہیں۔ سیر الاولیاء کی اصلاح فرمائی ہے کہ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ نہ ساکن ڈیکری تھے اور نہ ان کا کوئی تعلق حضور غوث پاک رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کے خاندان سے تھا۔ بلکہ وہ ساکن گنجہ تھے اور یہودی النسل تھے۔ نزاع ہانسی کی تصدیق و تائید فرمائی ہے کہ حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کو اسناد کے رد و قبول کا اختیار تھا لیکن اس میں خفیف سی ترمیم کر دی ہے یعنی یہ کہ جب حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کی سند چاک کر دی تو مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ نے ان کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس ماجرے حضرت باباصاحب علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ "تیر مردان خطا نمی شود"۔ ان کا سلسلہ چونکہ اوپر سے منقطع کیا ہے لہٰذا آخر سلامت رہا۔ یہ کہہ کر حضرت باباصاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی مجبوری بھی ظاہر کر دی کہ "دریدۂ جمال را فرید نتواں دوخت"۔ پھر تسکین کے لیے مخدوم صاحب سے ارشاد کیا کہ "خاطر جمع دار و دل تنگ مشو۔ ترا بہتر ازیں کاغذ نوشتہ دہم" کاغذ کا لفظ استعمال کر کے سند خلافت اور ولایت کی تقرری دہلی کا جھگڑا بھی ختم کر دیا۔ مولانا نے کلیر کے احوال میں تحریر کیا ہے کہ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ وہاں پہنچتے ہی عبادت اور فیض رسانی میں مشغول ہو گئے اور بعد وصال بھی ایسا ہی فیض جاری رہا۔ جیسا حیات میں تھا۔ عبادت کے متعلق لکھا ہے کہ ہمہ وقت محو و مستغرق رہتے تھے۔ اور فیض رسانی

کی تشریح یہ کی ہے کہ مسجد ڈھا دی۔ وبا پھیلا دی اور کلیر کے جنگل میں آگ لگا دی۔ اس کے بعد جب وصال ہو گیا تو مزار اقدس پہ برق جلال تڑپنے لگی جس کی وجہ سے کوئی شخص مزار کے قریب نہیں جا سکتا تھا۔ مجاور بھی دُور جا کر بس گئے تھے۔ شبیر وغیرہ برق جلال سے مستثنیٰ کر دیئے گئے تھے۔ اور وہی مزار پر اپنی دموں سے جھاڑو دیا کرتے تھے۔ البتہ ایک سنیاسی کو برق جلال نے مزار پہ حاضر ہونے کی اجازت دے دی تھی۔ اس نے مزار کے اندر کا حال دیکھنے کے لیے مزار میں شگاف و سوراخ کر دیا تھا اور اس کے بعد مزار کی نگرانی اور حفاظت کے لیے مجاور پھر بلا لیے گئے تو برقِ جلال شرما کر رہ گئی۔ غرض عرصہ دراز کے بعد حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کلیر جا کر الحاح و زاری کی تو حاضری کی اجازت ملی لیکن پھر بھی برق جلال تین مرتبہ مانع آئی اور اُن کی آستیں کا کچھ حصہ جُھلس دیا۔ چنانچہ مشہور ہے کہ حضرت شیخ گنگوہی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی اولاد کی ایک آستین کتنی ہی صحیح بنائی جائے مگر خود بخود چھوٹی ہو جاتی ہے۔ واللہ اعلم۔ قبر سے باہر نکل کر حضرت شیخ سے مخدوم پاک بغل گیر ہوئے اور ان کی درخواست پر برق جلال کو تنزیہ کے غلاف میں ہمیشہ کے لیے چُھپا لیا۔

مولانا اکرم شاہ پہلے شخص ہیں جنہیں صابری جلال کی توجیہ کرنے کا فخر حاصل ہے۔ یعنی یہ کہ مخدوم پاک کی ولایت سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے نقش قدم پہ ہے۔ چونکہ موسیٰ علیہ السلام صاحبِ جلال تھے اس لیے یہ بھی جلالی ہوئے۔ اور یہ کہ حضرت کے جلالی تصرفات کی وجہ سے دوستوں کی عقیدت بڑھی اور دشمنوں کے دل تھرّا گئے۔ اقتباس الانوار کی عزت و عظمت کا سبب بقول مولانا اکرم یہ ہے کہ جب یہ کتاب ختم ہونے کو آئی تو خواب میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم۔ چاروں اصحاب کرام رضی اللہ تعالیٰ

عنہم اور دیگر اولیائے نامدار کی معیت میں جلوہ افروز ہوئے ان میں غوث پاک، خواجہ غریب نواز حضرت گنج شکر۔ قطب عالم۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور حضرت شیخ صاحب صادق رحمۃ اللہ علیہم اجمعین شامل تھے۔ شیخ محمد صادق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے میری کتاب حضور نبوی (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) میں پیش کی۔ ارشاد ہوا کہ بہت عمدہ کتاب ہے ہم نے اسے قبول کیا اور فاتحہ پڑھکر ایک چادر نور اخضر کی مجھے مرحمت فرمائی۔ سب بزرگوں نے کتاب کو ملاحظہ فرمایا اور سب نے مجھے مبارکباد دی۔ خواب سے بیدار ہوا تو میرے بستر سے مشک و عنبر کی خوشبو آرہی تھی۔ حیرت ہے کہ متذکرہ بالا بزرگوں میں حضرت مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ انہیں کیوں نہیں دکھائی دیئے۔

پتہ نہیں کہ تذکرۃ الاتقیا کب لکھی گئی اور کس کی طبع زاد ہے۔ تاریخ فرشتہ جلد دوئم کے بمبئی ایڈیشن کے صفحہ ۷۲۹ پر اس کتاب کے حوالے سے مندرجہ ذیل روایت مسطور ہے کہ "شیخ فریدالدین مسعود گنج شکر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی خدمت میں تین شخص نظام الدین نام کے موجود تھے۔ ایک خود ان کے بیٹے دوسرے ان کے بھانجے اور تیسرے سید نظام الدین اولیاء بدایونی"۔ بابا صاحب نے اپنی ہمشیرہ کے کہنے سے مجبور ہو کر اپنے بھانجے نظام الدین کو خلافت و سجادگی کی مثال لکھ دی تھی۔ وہ مہر لگوانے ہانسی گئے۔ حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مہر لگانے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ان کی والدہ نے اصرار کر کے بھائی سے دوسری سند لکھوا دی۔ جب سند لے کر دوبارہ حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے وہ مثال چاک کر دی۔ عرصہ کے بعد جب بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے سید نظام الدین اولیاء بدایونی رحمۃ اللہ کو خلافت نامہ دے کر بھیجا تو شیخ جمال رحمۃ اللہ نے اسکی توثیق کر دی"۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ جمال رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت کے بھانجے نظام الدین کی سند چاک کی تھی اور نزاع کی کہانی ان ہی سے تعلق رکھتی ہے

اس نزاع کا بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے بھانجے علاء الدین علی احمد صابر سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اب تذکرہ نویس اور معتقدین خود فیصلہ کریں کہ ہانسی کا نزاع بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے کونسے بھانجے سے ہوا تھا۔ مخدوم علی احمد صابر کو خلافت ۶۴۶ھ میں ان کی والدہ بی بی ہاجرہ کے وصال کے بہت بعد از خود دی تھی۔ نتیجہ کھلا ہوا یہی نکلتا ہے کہ نزاع بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے بھانجے نظام الدین ہی سے ہوا تھا۔ لیکن عقل حیران ہے کہ بی بی ہاجرہ کے علاوہ حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی دوسری ہمشیرہ کہاں سے آگئیں۔ دوسری ہمشیرہ کے متعلق نہ کوئی خاندانی روایت ہے اور نہ تاریخ سے شہادت ملتی ہے۔ لہٰذا ان دوسرے بھانجے نظام الدین کا نمودار ہو جانا تعجبات سے ہے۔

مندرجہ بالا تذکروں کے علاوہ اور بھی تذکرہ جات ہیں جن کے نام بتا دینا ہی کافی ہیں۔ ان سب تذکروں میں اسی قسم کی بے سروپا روائتیں ہیں۔ البتہ "خزینۃ الاصفیاء" میں علی صابر اور مخدوم علی احمد صابر کے سوانح علیحدہ علیحدہ درج ہیں۔ علی صابر کا انتقال اس میں ۶۷۹ھ اور مخدوم علیہ الرحمۃ کا وصال ۶۹۰ھ میں لکھا ہے۔ (فہرست تذکرہ جات حسب ذیل ہے)

انوارالعاشقین ○ ماثرالکلام ○ مناقب احمدیہ و مقامات سعیدیہ[1]۔ (۱۲۸۸ھ) حقائق داؤدی ○ ثمرۃ الفوائد ○ چہار گلشن۔ سیر المتاخرین ○ ذخیرہ خوارزم شاہی ○ آرائش محفل ○ بحر زخار ○ طبقات جامی ○ مجمع المعارف ○ نوادر السفر قصر عارفاں۔ مرأۃ الضیائی ○ گلشن اولیاء ○ اسرار الاخیار ○ آئین اکبری ○ تاریخ ہفت اقلیم وغیرہ ○۔

---

[1] اس میں حضرت عبدالاحد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے بیان میں مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ کا ذکرہ آگیا ہے۔ یہ نقشبندی حضرات کا تذکرہ ہے۔

دو تذکرے اور ہیں جو اپنی خصوصیات کی وجہ سے سب سے جُدا ہیں۔ ان دونوں کی بنیاد کشف و الہام پر ہے۔ ایک "گلزارِ حقیقت صابری" ہے اور دوسرے کا نام "اسرارِ عترت فریدی" ہے۔ ماوراُ العقل ہونے کی وجہ سے یہ دونوں قابلِ توجہ ہیں۔ ان میں روایات کا حوالہ بزرگوں کی روحانی مکتوباتِ نطاب سے دیا گیا ہے جن کا وجود عالم ظاہر میں نہیں ہے۔ ان کی تشریح سوائے صاحبانِ کیفیت کے ممنوع ہے اس لیے مخفی رکھی گئی ہے۔ مگر ظاہری معیار پہ دیکھا جائے تو ان دونوں کے الہامی بیانات میں تناقص ہے۔ "گلزارِ حقیقت صابری" حضرت بادشاہ دوجہاں مخدوم شاہ محمد حسن چشتی قدوسی۔ معشوقِ الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کے الہامات کا مجموعہ ہے۔ اس کی تکمیل سنہ ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۲ء میں ہوئی تھی۔ انہوں نے روحانی صورت سے مخدوم پاک کی سیادت ثابت کی ہے۔

ہانسی کے نزاع کے متعلق ان کا الہام خاموش ہے۔ اس کتاب کے متعلق صوفی محمد جان صابری مراد آبادی نے جو حضرت محمد حسین مراد آبادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے خلیفہ ہیں اور جو ان بادشاہ دوجہاں معشوق الٰہی کے ہمعصر ہیں اپنی رائے اپنی تصنیف "قولِ فیصل" میں لکھی ہے کہ "اس کا فقرہ فقرہ برباد کنندۂ ایمان ہے اور اس کے مصنف نئی طریقت اور نئی شریعت کے مدعی ہیں کیونکہ وہ منکر بدیہات اور مخالف اجماع ہیں"۔

دوسرے بادشاہ دوجہاں حضرت محمد حسین فریدی اجودھنی ہیں۔ یہ معشوق الٰہی رامپوری کے خلیفۂ اعظم ہیں۔ اپنے شیخ کامل کے حکم سے برزخ بدل کر انہوں نے اسرارِ عترت فریدی سنہ ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۱ء میں مرتب کی تھی۔ یہ صاحب اولیاء اللہ کے روحانی کتب خانوں کے نائب محافظ دفتر بھی تھے انہوں نے اپنی روحانیت سے ہانسی کے نزاع سے ہر ممکن طریقہ سے انکار کیا ہے۔ ان کی یہ زیر دست تصنیف اس لیے بھی لائق شکریہ ہے کہ انہوں نے

باباصاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی اہلیہ اول کا نام و نشان بتا کر باباصاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ازواج کا سلسلہ مربوط کر دیا ہے۔ بہرحال کمال و کرامت یہ ہے کہ مرشد اور خلیفہ کے الہامات میں نمایاں فرق ہے اور ان کے اختلافات کو ان کے معتقدین رحمت سمجھتے ہیں۔

اسی زمانہ میں پیرجی خلیل الرحمٰن سرسادی نے اپنے آپ کو جمالی خاندان کا فرد ہونے کا دعویٰ کر کے سلسلۂ جمالی کی تجدید کا اعلان کیا تھا اور نزاع ہانسی کی بنیاد پر حضرت مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی توہین و تذلیل کی تھی۔ جمالی سلسلہ کو زندہ کرنے کے لیے انہوں نے الٹی گنگا بہائی ہے اور مخدوم پر اعتراضوں کی بھرمار کی ہے کیونکہ بغیر اس قسم کی مخالفت کے ان کی گاڑی چل نہیں سکتی تھی۔ صابریوں سے بڑی طویل بحث اور روح فرسا مجادلوں کے بعد یہ طے پایا کہ دونوں فریق اپنے دعووں کو دیوان صاحب اجمیر کے سامنے ۱۳۱۳ھ کے عرس کے ایام میں پیش کریں اور فیصلہ کروالیں۔ مگر تاریخ مقررہ پر باوجود تقاضوں کے پیرجی خلیل الرحمٰن حاضر نہیں ہوئے۔ لہٰذا دیوان صاحب اور متولی صاحب نے پیرجی خلیل الرحمٰن کو "مجالس غریب نواز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور چشتی خانقاہوں میں شرکت سے محروم کر دیا جب تک کہ اپنی گستاخیوں اور بدکلامیوں سے توبہ نہ کریں"۔ آخر کار سنہ ۱۳۱۴ھ کے عرس میں چشتی خانقاہوں کے جملہ سجادہ نشینوں نے یہ رائے دی کہ "کوئی فریق کسی کے بزرگ کی توہین نہیں کرے گا"۔ جب ان سب سجادہ نشینوں کا انتقال ہو گیا تو سنہ ۱۳۲۲ھ میں پیرجی نے ایک کتاب تصنیف کی اور دس سال بعد سنہ ۱۳۳۳ھ میں اس کتاب کی ایک ہزار جلدیں امرتسر میں چھپوائیں۔ اور شائع کیں اس کرامت کے ساتھ کہ صابریوں کو خبر نہ ہونے پائے۔ اس کتاب کا نام "آئینہ حق نما" ہے۔ پیرجی کے معتقدین اس کرامت کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ صابریوں نے خلاف معاہدہ چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تھی مگر اس چھیڑ چھاڑ کا وجود و ثبوت کہیں نہیں ہے۔ اب یہ کتاب صرف

چند مریدوں کے پاس رہ گئی ہے اور وہ بہ صیغہ راز اس شرط پہ لوگوں کو دکھاتے ہیں کہ کسی سے تذکرہ نہیں کریں گے تاکہ انہیں معاہدہ کی خلاف ورزی کا مرتکب قرار نہ دیا جائے۔

بہرحال تشریح جو کی گئی ہے اس سے تذکرہ نویسوں کے معیار، مذاق۔ اور علم کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان فضول روایتوں کی بنیاد اس تحریف پہ ہے جو سیرالاولیاء میں کی گئی ہے۔ اس زمانہ کا ماحول کچھ ایسا ہی ویسا تھا۔ اس عہد میں درویشی ایک طرح سے پیشہ بن گئی تھی۔ لہٰذا مخدوم پاک کے یہ جملہ تذکرے از قسم اضغاث الاحلام ہیں۔ تذکرہ نگار باوجود صاحب علم ہونے کے ماحول کے اثرات سے مرعوب ہو گئے تھے۔ اس تشریح کے بعد اب بھی کسی کو پس و پیش ہو تو مجبوری ہے۔ ضد اور ہٹ دھرمی کا علاج لقمان کے پاس بھی نہیں ہے۔ نتیجہ یہ کہ کوئی کسی کو سمجھ عطا نہیں کر سکتا۔

کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو
نہ لائے تاب جو غم کی وہ اپنا رازداں کیوں ہو

خُلاصہ

① یہ سب ۵ ہم تذکرے ناقابل اعتبار ہیں۔

② منکرین کا انکار معتقدین کی خوش عقیدہ کی وجہ سے ہے۔

③ جمالیوں کے اعتراض مغالطہ خیز ہیں اور ان میں روحانیت کی کوئی بات نہیں ہے۔

④ جمالی سلسلہ شروع ہی سے نہیں چلا۔ لہٰذا اس کے اجراء کی کوشش فضول کی گئی۔

⑤ حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی اولاد سلسلہ نظامیہ سے منسلک ہوئی اور ہے۔

⑥ تذکرہ نگاروں نے جلال و جمال میں امتیاز نہ کر سکنے کی وجہ سے مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا تعارف غلط اور خلاف شان لکھا ہے۔

صابری تعلیم

بظاہر کچھ نہیں کہتے مگر ارشاد ہوتا ہے

ہم اس کے ہیں جو ہم پر ہر طرح برباد ہوتا ہے

روحی فداہ حضرت سید لولاک صلوٰۃ اللہ علیہ کی مستند حدیث ہے کہ "انسان کے جسم میں ایک ایسا عضو ہے جس کے صالح ہونے سے سارا جسم صالح ہو جاتا ہے اور جس کے خراب ہونے سے سارا جسم خراب ہو جاتا ہے اور وہ عضو دل ہے" مطلب یہ ہوا کہ جیسا دل ہو گا ویسا ہی جسم ہو گا۔ دل اور جسم کی نورانیت روح کی تقویت کا باعث ہوتی ہے۔ روح کو فنا نہیں۔ موت صرف جسم کو آیا کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ آدمی خاک اور روح سے مرکب ہے مرجانے والے نورانی جسم کا مدفن بھی نورانی ہو جاتا ہے۔ لہٰذا صالحین کے قرب وجوار میں دفن ہونے والوں کو ان کی نُورانیت سے فائدہ پہنچتا ہے۔ گویا مرحوم اہل اللہ کے جسم و روح دونوں فیض رساں ہیں۔ شہیدوں اور ولیوں کو مُردہ نہیں سمجھنا چاہیئے۔ انہیں دربار الٰہی سے روزی ملا کرتی ہے۔ ان کا جسم سڑنے اور گلنے سے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ انوارِ الٰہی مثل صورتِ آفتاب و مہتاب کائنات کے ذرّے ذرّے پر ضوفگن ہیں۔ لیکن آنکھ دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتی۔ انوار الٰہی کے ملاحظہ کے لیے ایک عینک کی ضرورت ہے۔ ان

کی دید بغیر توسل و توسط کے ممکن نہیں۔ بہ مہر بنگرم جلوۂ آفتاب۔ صوفیوں میں شیخ کی برزخ توسل و عینک کا کام کیا کرتی ہے حقیقت یہ ہے کہ رب العالمین کی حضوری حاصل کرنے کا ذریعہ حضور قلب ہے اور حضور قلب بغیر شیخ کی تعلیم و محبت کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ شیخ کی محبت ہی اللہ کی محبت کا طریقہ سکھاتی ہے اور حیات میں تازگی و بالیدگی اسی سے پیدا ہوتی ہے۔

حضور قلب کی تعلیم ہر مذہب میں ہے لیکن اسلام میں سب سے بہتر اور سہل الحصول ہے۔ شریعت میں نماز۔ روزہ۔ حج و جہاد کی تعلیم ہے اور طریقت میں شریعت کی پابندیوں کے ساتھ ذکر و فکر کی تاکید ہے اور ذکر و فکر ہی سے حضور قلب حاصل ہوتا ہے تصور شیخ کو بدرقہ راہ بنایا گیا ہے۔ صوفیوں کے سب سلسلے و طریقے تصور شیخ کے قائل ہیں مگر اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ باوجود علم و فضل کے مولانا اشرف علی تھانوی نے "قصص الاکابر" کے صفحہ ۲۲ نمبر ۷ پر کیسے لکھ دیا کہ "چشتیوں میں تصور شیخ نہیں ہے" ان کے برخلاف مولوی رشید احمد گنگوہی صاحب نے ارواح ثلاثہ کے صفحہ ۳۹۰ پر لکھا ہے کہ "تین سال کامل حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا چہرہ قلب میں رہا اور میں نے بغیر اس سے پوچھے ہوئے کوئی کام نہیں کیا" حضور قلب کی تکمیل محض نظر۔ فکر اور گمان سے ہی نہیں ہوتی بلکہ کشف و شہود و یقین سے بھی ہوتی ہے اور اس کے حصول کے لیے خلوص و محبت یعنی للّٰہیت اصل شے ہے۔

شریعت و طریقت دونوں میں حضور قلب کی تعلیم ہے مگر دونوں میں نمایاں فرق ہے۔ اسلام نیت کی درستی کو ضروری سمجھتا ہے اور قول و عمل میں یکسانیت چاہتا ہے۔ علم کا مقصد عمل ہے اور صحیح عمل دل کی درستی پر موقوف ہے۔ صالح دل کی علامت یہ ہے کہ آدمی راضی بہ رضا ہو۔ صحیح مقصد کے لیے کوشش کرنا ہمارا کام ہے مگر نتیجہ اللہ کے اختیار میں ہے اپنی جدوجہد کے نتیجہ سے بے نیاز ہو جانے کے بعد ہی طاعت و عبادت میں ذوق پیدا

ہوتا ہے شریعت میں نماز، روزہ، زکوٰۃ و حج اُمّ المجاہدات ہیں۔ ان سب کی تعمیل دل کو دل بنا دیتی ہے۔ درجہ نفس کو طے کر لینے کے بعد مرتبۂ قلب میں داخلہ ہوتا ہے اور طریقت کے حدود شروع ہو جاتے ہیں۔ بہر حال اس طرح شرعی تعلیم کو حضور قلب کے ذریعہ کمال پر پہنچایا جاتا ہے۔ جس طرح شریعت نیت کی درستی کا انتظام کرتی ہے اسی طرح طریقت باطنی احساسات کو صحیح بناتی ہے۔ طریقت والے کسی نئی تعلیم کے مدعی نہیں ہیں۔ البتہ شریعت کی ترویج و تکمیل کے لیے حسن و خوبی سے نئی سمجھ اور نیا طریقہ پیش کرتے ہیں۔ طریقت کو شریعت سے جدا سمجھنا ناسمجھی کی دلیل ہے۔ شریعت اور طریقت میں جسم و روح کا سا تعلق ہے۔ شریعت بغیر طریقت کے ایک خوشنما پھول ہے جس میں خوشبو نہ ہو۔ اور طریقت کو بغیر شریعت کے ایسا نغمہ تصور کرنا چاہیے جس میں سُر نہ ہو اور بے آہنگ ہو۔

طریقت کے جملہ سلسلوں کا مقصد ایک ہی ہے۔ یعنی معرفت الٰہی[1] لیکن مختلف طبقوں کی وجہ سے حصول مقصد کے طور و طریقے میں خفیف سا فرق ہے۔ چنانچہ سلسلہ چشتیہ کی بھی ایک امتیازی خصوصیت ہے اس کا اندازہ تعلیم چشتیہ کے معمولات سے کیا جا سکتا ہے اس کی تعلیم درسی نہیں ہے۔ حضرت عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ نفس کی مخالفت چشتیوں میں عبادت کی جان ہے اور عام رسم و راہ پھنسے رہنا ان کے یہاں کفر ہے چشتی نفس کو صنم اکبر سمجھتے ہیں۔ انہوں نے یہ اصول قرآن پاک سے اخذ کیا ہے[2] چشتی مجاہدات کے ذریعہ تصفیہ و تزکیہ کرکے دماغ کو صاف کیا کرتے ہیں۔ پھر قلب پر صیقل کرکے نقوش بناتے ہیں

---

۱ سید اکبر حسین ریٹائرڈ جج الٰہ آبادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے معرفت کی تعریف پر لطف لکھی ہے۔

تو دل میں تو آتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا — بس جان گیا میں تری پہچان یہی ہے

۲ سورۂ نازعات کی آیات نمبر ۴۰ و ۴۱ ملاحظہ ہوں۔

ان نقوش کو صفات و ملکات سے موسوم کیا جاتا ہے۔ تزکیہ و تصفیہ میں شیخ کی توجہ کے علاوہ ورد و وظائف بھی ہوتے ہیں مگر اصل تکمیل محبت بھری آہ سوزاں سے ہوتی ہے۔ محبت ہی عروج کا باعث بنتی ہے۔ اس طرح اپنے آپ کو پہچان لینے کے بعد خدا کی معرفت کا شعور پیدا ہو جاتا ہے۔ چشتی محبت ہی کی خاطر نفس کی مخالفت کر کے اسے مہذب بنا لیتے ہیں تہذیب نفس اور محبت کا تقاضا ہے کہ اچھے بُرے سب کے ساتھ اخلاق برتا جائے۔ ہر شئے نیک و بد پہلو رکھتی ہے۔ نیک تو نیک ہوتا ہی ہے مگر بد کو نیک بنا لینا کمال بندگی ہے۔ حضرت سلطان المشائخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ارشاد گرامی ہے کہ "درصحبت ما باش یا ما درصحبت تو باشیم" بد کو نیک بنانے کی یہی بہترین صورت ہے۔ اس سے اتحاد بڑھتا ہے اور توحید کی تبلیغ ہوتی ہے۔ بہرحال چشتی نفس کی مخالفت کر کے صبر و رضا کے عادی ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی نشانی ہے۔ رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ۔[1]

چشتیوں میں محبت و ہمنشینی کے ساتھ اتباع و تقلید ضروری ہے لیکن وہ ارباب ظن و تخمین کی تقلید کو حرام سمجھتے ہیں اس لئے تجدید کے وہ معترف ہیں مگر تاسیس کے قائل نہیں ہیں۔ حق یہی ہے کہ پُرانی عمارت کو ڈھا کر از سر نو عمارت بنانا طول اَمل ہے اور اسراف بھی ہے۔ پرانی عمارت کو مفید و کار آمد بنانے کے لیے حسب ضرورت ترمیم کر دینے کو تجدید کہتے ہیں۔

خواجگانِ چشت کے معمولات۔ حالات اور واقعات سے ظاہر ہے کہ وہ مریدں اور خلفاء سے چکی پسوانے کے بجائے شریعت کی پابندی کے ساتھ اپنی قلبی توجہ سے قلبی احساسات کو درست کرتے ہیں اور روزانہ زندگی میں ھر طرح نفس کی آزمائش و اصلاح کرتے ہیں۔ تدبر۔ تفکر۔ اجتہاد و تجسس کے طریقے سکھلتے ہیں تاکہ اخلاق الٰہی حاصل کئے جا سکیں[2]۔ خواجہ بزرگ حضرت غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ

[1] سورہ بنی اسرائیل کی آیت نمبر۲۷۔ [2] سوانح خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مولفہ احقر میں اسکی تفصیل تعلیم چشتیہ والے باب میں ملاحظہ ہو۔

کی ظاہری حیات میں جذبہ و سلوک دونوں پائے جاتے ہیں مگر سلوک کا غلبہ ہے۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے یہاں جذبہ کی کسی قدر زیادتی ہے۔ انہوں نے حضرت خضر رومی قلندر رحمۃ اللہ علیہ سے خلافت کا تبادلہ کیا تھا۔ اپنا سلوک انہیں دیا اور ان کا جذبہ خود لیا۔ یہ سب جانتے ہیں کہ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ میں جذبہ و سلوک کی مساوات تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے چشتی تعلیم کی تبلیغ سے سلسلہ کو بام ترقی پر پہنچایا۔ حضرت مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ میں مجذوبیت کی ازحد زیادتی ہے اور حضرت سلطان المشائخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے یہاں سلوک کی خوشگوار بہار ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ جب ہندوستان میں فتنہ و فساد کی لہر دوڑی تو مذہب میں بھی تحریف ہوئی۔ اخلاق بگڑ گئے اور فرعونیت شروع ہوئی اور طبیعتیں ذلت و پستی کی طرف مائل ہوئیں تو حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے رفاہ عام کے لیے جذبہ و سلوک کو علیحدہ کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو مجذوب سالک کے درجہ میں خلافت عطا فرمائی اور حضرت سلطان جی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو سالک کامل اور رئیس فقیر کا مرتبہ دے کر خلیفہ بنایا۔ گویا اس طرح چشتیہ سلسلہ کی دو شاخیں ہو گئیں۔ اصل یہ ہے کہ اس زمانہ کی کمزور طبیعتیں جذبہ و سلوک دونوں کے بوجھ کی متحمل نہیں ہو سکتی تھیں۔ یہ حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا اجتہاد ہے کہ نہایت خوبی سے سلوک و جذبہ کو علیحدہ کر دیا۔ وصال سے پہلے جو ارشاد فرمایا تھا وہ مختلف نوعیتوں سے اہمیت رکھتا ہے۔ فرمایا کہ "علم سینہ من بہ شیخ نظام الدین بدایونی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ رسید و علم دل من بہ شیخ علاءالدین علی احمد فائز گردید" ظاہر ہے کہ دل سینہ کے اندر ہوتا ہے۔ لہٰذا علم دل خفی در خفی ہوا۔ اس لیے مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنا نمونہ آپ ہیں۔ عناصر میں جو مرتبہ باد یا ہوا کا ہے وہی درجہ روحانیت میں

مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا قیاس کیا جاسکتا ہے۔ ان کی تعلیم از دل خیزد و بر دل ریزد کی طرح کی ہے۔ وہ ظاہر سے بے نیاز رہے مگر ان کا سلسلہ آب و تاب سے چلا۔ یہی حقیقت لوگوں کو حیران کئے ہوئے ہے۔ اسی حیرت کی وجہ سے کچھ لوگ ان کے وجود تک کے منکر ہوگئے معتقدین نے معاندین کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ اپنے انکار سے نہیں ہٹے۔ مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کے وجود کا ثبوت بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کے مندرجہ بالا سینہ و دل والے ارشاد میں بھی موجود ہے۔ یعنی حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ان کا پورا نام دیا ہے تاکہ اس کا انطباق کسی اور پر نہ ہو سکے۔ حضرت سلطان المشائخ کی تعلیم اور ان کے سلسلہ کی تبلیغ جس طرح ہوئی وہ آنکھوں کے سامنے ہے۔ مگر حضرت صابر علیہ الرحمۃ کی تعلیم و تبلیغ قلبی ہونے کی وجہ سے چشم ظاہر سے اوجھل رہی۔

بتایا گیا ہے کہ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ گیارہ سال کی عمر میں گوشہ عزلت میں بٹھا دیئے گئے تھے اور اکیس سال بعد ان کو خلافت دی گئی تھی۔ لیکن ان کی باطنی تعلیم کی تفصیل نہیں بتائی گئی ہے کشفی تذکرہ کا بیان ہے کہ دوران عزلت میں شغل نوری کی مشق کروائی گئی تھی۔ خواجگان چشت مرید کو حسب مراد بنانے کے لیے ابتداء میں کچھ مجاہدے بھی کرواتے ہیں۔ پھر اپنی توجہ سے کامل بنا دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے مرید عالم تجلیات میں محو ہو جاتا ہے۔ اسی اصول پر مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو تین سال ظاہری تعلیم دی پھر گوشہ میں بٹھا کر صفات و ملکات کے جلووں سے آشنا کیا۔ اس طرح ذات و نفس پر عبور کرا کے اجتہاد و تجسس کے ذریعہ انابت الٰہی کی اہلیت پیدا کر دی۔ حضرت خواجہ بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ شیخ میں اس قدر دل کی قوت اور ضمیر کی صحت ہونا چاہیئے کہ جس کو مرید کرے اس کے سینہ کی زنگار اپنی قوتِ باطن سے صیقل کر دے اور رازہائے فطرت سے

آگاہی دیدے۔ جب مرید میں اتنی قوت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ شخصی و کائناتی زندگی کے مضمون کو اشاروں اشاروں میں سمجھ لیا کرتا ہے اور گفت و شنید کی اسے ضرورت نہیں رہتی مختصر یہ کہ حضور قلب کا کمال اسے حضوری کا اہل بنا دیتا ہے۔ یہ کمال بغیر شیخ کی محبت و توجہ کے حاصل نہیں ہوا کرتا۔ خواہ ذاتی طور پہ کتنے ہی مجاہدات کئے جائیں۔ مگر فضل الٰہی کی اور بات ہے جسے چاہے اور جس وقت چاہے آنکھ جھپکتے ہیں سرفراز فرما دے۔

جب مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کو روحانی تعلیم خاص طور پہ اس طرح پہ دی گئی ہے تو ان کی خلافت اور تبلیغ کا طرز دیگر خلفاء سے مختلف بھی ہونا چاہیئے اور یہی ان کی تعلیم و تبلیغ میں نُدرت ہے ان کی تعلیم چونکہ قلبی تھی لہذا عقل کی اس تک رسائی نہیں ہو سکی۔ اور جب ظاہری عقل و منطق سے اسے سمجھا تو نتیجہ صحیح نہیں نکلا۔ ان کے یہاں محض توجہ و جذب سے کام لیا جاتا ہے۔ اور کیفیت جذب میں اختیار نہیں ہوا کرتا۔ می بُرد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست۔

علم و عمل ایک دوسرے سے متعلق ہیں اور نسبت لزوم رکھتے ہیں۔ اب اگر ان دونوں میں سے ایک جز پوشیدہ ہو تو دوسرے ظاہری جز سے اس پوشیدہ جُز کا قیاس کیا جاسکتا ہے چنانچہ مشہور ہے عشق من پیدا و معشوقم نہاں۔ مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیم کو راز ہی کہنا چاہیئے مگر نتیجہ اظہر من الشمس ہے۔ ان کی تعلیم تسخیر کا لُب لباب یہی ہے کہ:

خویش را صافی کن از اوصاف خود
تا بہ بینی ذات پاک وصاف خود

خُلاصہ

(۱) طریقت میں حضورِ قلب کی اہمیت ہے اسی لحاظ سے تصور کی عام زندگی میں بھی بغیر نیت و تصور کے عزم و ارادہ کا امکان نہیں ہو سکتا۔

(۲) چشتی مشائخ مریدوں کو اپنی صحبت میں رکھنا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ تربیت صحیح ہو سکے۔

(۳) مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی تعلیم قلبی و باطنی تھی اور اس کی بنا محبت و خلوص پر تھی۔

(۴) صابریوں میں شیخ کامل اپنی توجہ سے مراتب طے کروا دیتا ہے۔

(۵) صابری سلسلہ میں مجاہدات برائے نام ہیں اور جذبہ کی کارفرمائی زیادہ ہے۔

(۶) صابری مشائخ بجائے پند و نصائح کے نظر سے حقیقت آشنا کیا کرتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حق حق حق

صابری سلسلہ

این خانہ ہمہ آفتاب است

بعض معاندین کا گمان ہے کہ جس کو صابری سلسلہ کہا جاتا ہے وہ شمسی سلسلہ ہے مگر یہ قطعی غلط ہے۔ نہ حضرت شمس الدین ترک پانی پتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کبھی ایسا دعویٰ کیا اور نہ ان کے متبعین نے اس قسم کا کہیں اعلان کیا۔ حضرت ترک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ حضرت مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کے تنہا اور واحد خلیفہ تھے اور وہ اپنے شیخ کی ہُوبہُو تصویر تھے۔ استغراق کی وجہ سے وہ بھی دنیا سے بے نیاز رہے۔ اور اسی کیفیت میں انہوں نے صابری سلسلہ کی اشاعت بھی کی سوانح نویسوں کا عجیب مذاق ہے کہ صابری سلسلہ و تعلیم کا تعارف کرانے کے بجائے حقائق کو نظر انداز کر کے اپنے قلم کو قصص عجیبہ، حکایات غریبہ اور نوادر و امثال کی طرف موڑ دیتے ہیں۔ یہ ذہنیت انہوں نے غیر اسلامی عقیدوں۔ قدیم حکایتوں اور اسرائیلی روایتوں سے اخذ کی ہے۔ حضرت مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا قیام کلیر میں ۶۴۶ھ-۱۲۴۸ء سے ۶۷۹ھ-۱۲۸۱ء تک تینتیس ۳۳ سال رہا ہے وہاں انہوں نے اس مدت ولایت و خلافت دونوں کے فرائض اپنے مخصوص طرز میں ادا کیئے۔ ولایت کے انتظام باطنی ہوتے ہیں جن کے متعلق اہل ظاہر کو کچھ علم نہیں ہوا کرتا۔ اس علم کو حاصل کرنے کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت خضر علیہ السلام کے پاس بھیجے گئے تھے اس کے علاوہ یہ بھی کسی کو خبر نہیں ہوتی کہ صاحب

ولایت کا انتخاب کس طرح ہوتا ہے۔ مگر صاحبِ ولایت کے برخلاف خلیفہ کا فرض تبلیغ و اشاعت سلسلہ کے متعلق ظاہری ہوتا ہے۔ جن خلفا کو ولایت کا درجہ نہیں ہوتا ممکن ہے کہ وہ روحانی طور پر صاحبانِ ولایت سے کچھ معلومات حاصل کرتے ہوں۔ خلیفہ سلسلہ و تعلیم کے قیام و ترقی کا انتظام اپنے ماحول و زمانہ کے لحاظ سے کیا کرتا ہے ۶۷۹ھ/۱۲۸۱ء کے بعد حضرت ترک پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے پچیس سال اور ان کے خلیفہ حضرت جلال الدین کبیر الاولیاء نے اُنچاس برس فرائض خلافت اپنے مخصوص طرز سے ادا کئے۔ پھر کبیر الاولیاء کے خلیفہ حضرت شیخ العالم احمد عبدالحق ردولوی رحمۃ اللہ علیہ نے ۷۶۵ھ/۱۳۶۳/۶۴ء سے ۸۳۷ھ/۱۴۳۳/۳۴ء تک ردولی کو مرکز بنا کر نئی شان سے سلسلہ کی خدمت و توسیع کی۔ ان بزرگوں کی عظمت کرامتوں سے اس قدر ظاہر نہیں ہُوئی جس قدر ان کے عملی کارناموں سے اس کا اظہار ہوا محض کرامتیں ہی بزرگی کا معیار نہیں ہیں۔ دراصل ان حضرات کے کارناموں کو ان کے عہد و زمانہ کی روشنی میں ملاحظہ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ان کے کمالات کی عظمت و وقعت کے متعلق صحیح رائے قائم کی جا سکے۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے لکھا ہے کہ عہدِ تغلق میں علمی معیار گر گئے تھے۔ لیکن حالات مظہر ہیں کہ اس عہد میں نامی گرامی علماء موجود تھے۔ ان ہی میں حضرت شہاب الدین مہمرہ اور ان کے شاگرد و خلیفہ حضرت ضیاء الدین نخشبی بھی تھے۔ فیروز شاہ کے مدرسہ کا مشرق کی اعلیٰ درس گاہوں میں شمار تھا۔ مگر با ایں ہمہ حالات اس قدر بگڑے ہوئے تھے کہ ترقی کی کوئی صورت نہ بن سکی۔ فیروز شاہ نے خود بھی اس حقیقت کا اعتراف و اعلان کیا ہے۔ مورخین کا متفقہ بیان ہے کہ فیروز تغلق (۷۹۰ھ/۱۳۸۸ء) کے وقت سے بابر کی آمد (۹۲۹ھ) تک زمانہ پُر آشوب تھا، افکار و معیار بدل گئے تھے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں تغیر و انحطاط واقع ہو گیا تھا۔ اور مذہبی عقائد میں عجیب ابتذال نمایاں ہُوا تھا۔ رسوائی و ذلت کے اس تلاطم میں نہ علماء و مشائخ بچ سکے اور نہ عبّاد و زُہاد۔ فیروز شاہ

کے عہد میں اباحتی فرقے نمودار ہوئے۔ احمد بہاری نے خدائی کا دعویٰ کیا۔ بھگتی تحریک نے سر نکالا۔ نواہوں نے اس کی مخالفت کی۔ پھر لودھن برہمن نے اعلان کیا کہ ہندو مذہب اور اسلام دونوں ایک ہیں۔ جب اسلام قبول کرنے کے لیے اس سے کہا گیا تو جان دیدی مگر ہندو مذہب پر قائم رہا۔ اس عہد میں ارتداد کا زور تھا مسلمان ذوق و شوق سے ہندو مذہب اختیار کر رہے تھے۔ اس فضا میں نظامی و سہروردی دونوں انگشت بدنداں تھے اور صابری اپنی محویت میں مست و سرشار تھے آخر کار نظامی شمالی ہند کی زبوں حالی سے بیزار ہو کر تبلیغ و اشاعت کے لیے مالوہ۔ دکن۔ گجرات اور بنگال کو چلے گئے۔ ناصر الدین محمود شاہ تغلق ۷۸۰–۹۶ھ/۱۳۷۷–۹۳ء کے آخری عہد میں تیموری حملوں کی تباہ کاریوں سے سماجی زندگی مزید منتشر ہوئی اور رہے سہے حواس جاتے رہے۔ پنجاب میں جب ابتری پھیلی تو سہروردیوں نے نظامیوں کی خالی کردہ خانقاہوں پر قبضہ جما کر اپنا سیاسی اقتدار بڑھایا۔ ایسی ہی جملہ خرابیاں ۸۱۶ھ/۱۴۱۳/۱۴ء میں سلطنتِ تغلق کی بربادی کا باعث ہوئی اسی شور و شغب میں دو برس کے بعد ۸۱۷ھ/۱۴۱۵ء میں ملتان کے ناظم خضر خان نے حکومت سادات کی طرح ڈالی۔ سیّدوں کی یہ سلطنت محدود و مختصر تھی۔ دہلی کے گرد و نواح میں امیروں نے اپنی اپنی ریاستیں بنالی تھیں۔ ان کی سرکشیوں سے تنگ آکر سادات کے چوتھے فرماں روا سید علاء الدین نے تخت سے دستبردار ہو کر بدایوں میں پناہ لی۔ اسی موقع پر ۸۵۴ھ/۱۴۵۰/۵۱ء میں لاہور کے گورنر بہلول لودھی نے (متوفی ۸۹۴ھ/۱۴۸۸/۸۹ء) نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ یہ لودھی خاندان ۹۲۹ھ/۱۵۲۲/۲۳ء تک برسرِ اقتدار رہا۔ اسی سال ۹۲۹ھ میں بابر نے ابراہیم لودھی (متوفی ۹۳۲ھ/۱۵۲۵/۲۶ء) کو میدان پانی پت میں شکست دے کر مغلیہ سلطنت کا سنگِ بنیاد رکھا۔ تیمور اور بابر کے حملوں کے درمیان سکندر لودھی ۸۹۴/۹۲۳ھ/۱۴۸۸/۱۵۰۱ء نے بڑی قابلیت سے سلطنت کا انتظام کیا۔ علماء کو دُور دُور سے بلا کر اُجڑی ہوئی بزم کو از سرِ نو رونق دینے کی کوشش کی۔ اس کے

عہد میں سب سے پہلے معقولات کی ترویج ہوئی مگر ذہنی انحطاط اپنی جگہ باقی رہا اور مذہب کی گت بنی سکندر لودھی کے عہد میں دو بھائی شیخ عبد اللہ اور شیخ عزیز اللہ ساکنان ملتان، دہلی میں آئے تھے۔ ان دونوں کے استاد سماع الدین تھے جو میر شریف جرجانی کے شاگرد تھے سماع الدین نے دہلی سے منتقل ہو کر تھنبور علاقہ جے پور میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ سکندر لودھی نے تعلیم دینی تبلیغ کے لیے شیخ عبد اللہ کو دہلی میں اور شیخ عزیز اللہ کو سنبھل میں متعیّن کیا تھا۔ اس زمانہ میں صابریوں کی باطنی و قلبی تعلیم حسب معمول چلتی رہی۔ نظامیوں کے چلے جانے کے باعث شمالی ہند بظاہر چشتی تعلیم سے محروم ہو گیا تھا۔ ظاہری علوم کی ترویج اقتصادی بدحالی اور آئے دن کے مصائب مذہب سے بے اعتنائی کا باعث ہوئے ایسی حالت میں حضرت شیخ العالم احمد عبد الحق ردولوی نے ضروری سمجھا کہ خلوت سے نکل کر جلوت کو رونق بخشیں اور صابری تعلیم کی ظاہری طور پہ تبلیغ فرمائیں۔ اس طرح انہوں نے حال کے ساتھ قال کو بھی شامل کر لیا۔ صابری خلفا میں وہی پہلے شخص ہیں جنہوں نے ردولی میں پہلی مرتبہ صابری خانقاہ بنائی۔ زبردست لنگر جاری کیا۔ اور غریب نواز رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ اور حضرت بابا فرید الدّین گنج شکر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے اصول پر پہلے شریعت پر عمل کرنے کی تاکید کی پھر طریقت کے اصول سکھائے۔ اس طرح ظاہری و باطنی طور پہ حق کی اشاعت کر کے صابری سلسلہ کو مقبول بنایا۔ چونکہ انہوں نے سلسلہ کی تعلیم و تبلیغ میں تجدید فرمائی ہے۔ لہٰذا صابری سلسلہ کے مُجدّد در اصل وہی ہیں۔ ان کے مُرشد حضرت کبیر الاولیا۔ رحمۃ اللہ علیہ کی زبان پر اسمُ "حق" جاری کیا۔ انہوں نے ہی شیخ العالم ردولوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا نام "عبد الحق" رکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں "حق" اسم اعظم بن گیا۔ ان کے حلقہ والے اب بھی اسی اسم کا ورد کیا کرتے ہیں۔ مُدوّر شکل میں قلب صنوبری[1] کی لوح پر اس کا

---

[1] قلب صنوبری بائیں طرف پستان سے دو انگل نیچے ہے۔

نقش بناتے ہیں۔ حق کی تعریف یہی ہے کہ ثابت و قائم رہے۔ اسم حق دراصل شیخ عبد الحق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی تعلیم کا عطر و خلاصہ ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ حق اپنے مختلف رنگوں میں ہر جگہ جلوہ افروز ہے۔ اس کے ماسوا، سب باطل و فانی ہے جس نے حق کو سمجھ لیا وہ دلائل و براہین کو پلے چوبیں سے زیادہ وقعت نہیں دیتا۔ اس کے سامنے علم معقول شرمندہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ ظن و تخمین کی ضرورت اسی وقت ہوتی ہے جب کہ حق نظر سے اوجھل ہو، صوفی جانتے ہیں کہ مجاہدہ بغیر مشاہدہ کے فعل عبث ہے۔ یہ ورد و وظائف اور اشغال و تصوّر حصولِ حق کے ذرائع ہیں ان کو اصل نہیں سمجھنا چاہیئے۔ مشاہدہ حضور قلب سے حاصل ہوتا ہے۔ اور مشاہدہ سے ہی حق تک رسائی ہوتی ہے جس کے قلبِ صنوبری میں حق جاگزیں ہو وہی حق کو پا بھی سکتا ہے۔ وصول حق کا ایک طریقہ نفی بھی ہے باطل کی نفی کرنے سے حق مل جاتا ہے۔ اسی وجہ سے چشتی و صابری پہلے اپنے نفس کی نفی کرتے ہیں۔ ہَوا و ہوس سے دستبردار ہو کر نفس کو مہذب بنا لیتے ہیں۔ بے لوثی کے ساتھ برابر سعی کرتے ہیں اور اپنے اپنے طور پر معاشرے کی اصلاح میں سرگرم رہتے ہیں۔ اب جو حضرت مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کو سمجھنا چاہے وہ قیاس و حجّت سے کام نہ لے۔ وہ توہمات کی نفی کرے اس کے بعد ان کی صورت نظر آجائے گی "صورتے از بے صورتی آید پدید"۔ بہر حال حضرت احمد عبد الحق کی پُوری تعلیم لفظِ حق میں بند ہے۔ اسی تعلیم کو تقویت پر وہ گمراہ درویشوں اور غافل دولتمندوں کی اصلاح فرمایا کرتے تھے اور درویشوں کی اصلاح کے متعلق بعض لوگوں نے اپنی فہم و فراست سے یہ سمجھا کہ وہ درویشوں کی نسبتیں سلب کر لیا کرتے تھے۔ چنانچہ اقتباس الانوار کے صفحہ ۲۱۲ پر یہی معنی بتائے گئے ہیں۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ دولت مندوں کو راہِ راست پر لانے کے ثبوت میں لودھی بادشاہوں۔ بابر اور دیگر امرا کے نام ان کے خط پیش کیے جا سکتے ہیں، بعض رؤسا۔ سمجھتے تھے کہ وہ ان سے دنیا ترک کروا دیں گے۔ لہٰذا ان سے گریز کرتے تھے چشتیہ سلسلہ میں امیروں سے ربط رکھنا بھی ان ہی کی جدّت ہے جو

اس زمانہ و ماحول کا تقاضا تھا۔

عام طور پر مشہور ہے کہ حاجتمند ایک سیر آٹے کی روٹی دودھ اور گھی میں پکا کر بطورِ نذر کے لاتے تھے۔ اس کے بعد شیخ العالم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی دعا سے ان کی مرادیں حق تعالےٰ پوری کر دیتا تھا۔ اس کا نام "توشہ" ہے۔ توشے کی روٹی سوائے اپنی اولاد اور مریدوں کے کسی اور کو نہیں دیتے تھے۔ مگر حضرت عارف رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ نے اس کی تقسیم عام کر دی تھی۔

اس رسم توشہ کی بنا یوں پڑی کہ جب حضرت رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کے محبوب مرید حضرت بختیار رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو سفر سے واپسی میں زیادہ دیر ہو جاتی تو اُن کی بیوی اس قسم کی روٹی پیش کر کے ان کی واپسی کے لیے دُعا کی التجا کیا کرتی تھیں ایک مرتبہ حضرت بختیار رحمۃ اللہ علیہ کو واپسی میں زیادہ دیر ہوئی تو ان کی بیوی نے دعا کی استدعا کی فرمایا "روٹی لاؤ" عرض کیا کہ آج آٹا نہیں ہے ارشاد ہوا "تو بختیار بھی نہیں ہے"۔ چنانچہ اثناء راہ میں حضرت بختیار رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا وصال ہو گیا اور وہیں کسی جگہ دفن کر دیئے گئے اب وہ "پیر غیب" کے نام سے مشہور ہیں اور ان کا روٹ پکا کر منت بھی مانی جاتی ہے [1]

حضرت شیخ العالم توشہ ردولوی رحمۃ اللہ علیہ کا وصال مبارک شاہ کے عہد میں ۸۳۷ھ/۳۴-۱۴۳۳ء میں ہوا۔ ان کے صاحبزادے حضرت شیخ عارف رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۸۸۶ھ/۱۴۷۷ء) ان کے خلیفہ و جانشین ہوئے اور شیخ عارف رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ ان کے صاحبزادے شیخ محمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (متوفی ۸۹۸ھ/۹۳-۱۴۹۲ء) قرار پائے ان دونوں بزرگوں نے شیخ العالم کے طرزِ تعلیم و اصول کی بڑی خوبی سے اشاعت کی یعنی مریدوں کو شریعت پر مستحکم کر کے راہ طریقت دکھائی

[1] کلیر شریف میں نہر کے پار ایک صاحبِ مزار "پیر غیب" کے نام سے مشہور ہیں مگر یہ بزرگ حضرت بختیار رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ سے پہلے کے ہیں۔

حضرت عارف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے اخلاق کریمانہ کا ہر شخص معترف تھا اور ہر ایک یہی سمجھتا تھا کہ وہی ان کا منظورِ نظر ہے۔ اخلاق کریمانہ ہزاروں کرامتوں کی ایک کرامت اور اصل میں تصوف نام ہی اخلاق کا ہے۔ بہلول لودی (متوفی ۸۹۴ھ/۸۹-۱۴۸۸ء) نے ہر چند چاہا کہ جس طرح داد و دہش سے سہروردیوں کو رام کر لیا ہے۔ اسی طرح حضرت عارف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو بھی اپنا مطیع بنائے مگر وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔

حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے متعلق شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اخبار الاخیار میں لکھا ہے کہ "اگرچہ دستِ بیعت از شیخ محمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کردہ وے معتقد و عاشق شیخ احمد عبدالحق رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ است"۔ زبدۃ المقامات میں ان کا تعارف اس طرح کیا گیا ہے کہ "شیخ عبدالقدوس قدس سرہٗ از شیوخ مشہورہ ہندوستان است و از کبار ایشاں از فرزندانِ شیخ صفی الدین است کہ در اصول و فروع علوم از فحول محققین بود، صاحب تصنیف مشہورہ۔ سکر و شورش قوی داشت و وجد و سماع کثیر باوجود کثرت جذبات و توفیر غلبات در اتباع سُنّتِ سنیہ بغایت متعین بود و در التزام امور دینیہ سخت متمکن"۔ ان کے متعلق علمائے بدایونی کی رائے ہے کہ "مناقب و کمالات وے از شرح و بیان مستغنی"۔ سرڈاکٹر اقبال نے ان کی فضیلت کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے ایک مقولہ کی داد دی ہے۔ لکھتے ہیں کہ "صوفیانہ ادب کے سارے سرمائے میں شاید ہی کوئی ایسی مثال مل سکے جہاں ایک مختصر سے جملہ میں نبوت و ولایت کے نفسیاتی فرق کو اس درجہ صاف و واضح طریقہ پر بیان کیا گیا ہو[1] اور وہ مقولہ یہ ہے "محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم" در قاب قوسین او ادنےٰ رفت و باز گردید۔ واللہ ما باز نہ گردیم"[2] مگر ان سب صاحبان کے خلاف لاہور یونیورسٹی

[1] اسلام میں مذہبی افکار کی تجدید۔ ڈاکٹر اقبال کے خطبات صفحہ ۱۴۴

[2] لطائف قدوسی ص ۶۵ لطیفہ ۷۹

کے پروفیسر تاریخ جناب محمد اسلم صاحب نے اپنی تازہ تصنیف "دینِ الٰہی اور اس کا پس منظر" میں حضرت عبدالقدوس کے عقائد وحدت الوجود وغیرہ کی مخالفت کرتے ہوئے نہ صرف گنگوہی کے ایک مقولہ پر اعتراض کیا ہے بلکہ صابری سلسلہ کے نام پر بھی بٹہ لگایا ہے۔ پروفیسر صاحب نے اکبری دینِ الٰہی کے پس منظر کی بنیاد مُلّا عبدالقادر بدایونی پر رکھی ہے جس کی تاریخی لحاظ سے کوئی اہمیّت نہیں۔ مُلّا صاحب کی صدق مقالی تسلیم مگر ان کا نقطۂ نظر محدود تھا۔ اس میں اسلامی جامعیت و وسعت نہیں پائی جاتی۔ انہوں نے اپنے ذاتی معیار کو مدنظر رکھا ہے اور اکبر کے نظریہ کو سمجھنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ مغل ہر زمانہ میں باوجود مسلمان ہو جانے کے اپنے قومی رسم و رواج کے پابند رہے ہیں۔ اکبر مغل تھا۔ چنگیز خاں کی طرح بے پڑھا لکھا تھا مگر بہادری ذہانت و فراست میں اس کی مانند تھا۔ دونوں کے فتوحات اور طرز حکومت میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ چنگیز کا نظریہ یہ تھا کہ جس طرح آسمان کا اکیلا حکمران آفتاب ہے اسی طرح زمین کا حاکم بھی ایک ہی ہونا چاہیئے[۱] اکبر مسلمان تھا اور اس کے ابتدائی حالات سے ظاہر ہے کہ پابند مذہب تھا۔ اور مذہب کے سمجھنے کا شوق بھی رکھتا تھا۔ اسی غرض سے اس نے عبادت خانہ کا اجراء بھی کیا تھا۔ مگر علماء اسلام کی تنگ نظریوں اور نفسانیت سے مایُوس و بیزار ہو کر فتح گجرات کے بعد مذہبی تحقیق کے سلسلہ میں سب سے پہلے پارسیوں، پھر نمبروار پرتگال کے عیسائیوں جینیوں اور برہمنوں سے تعلقات پیدا کیئے اور ہر ایک سے کچھ اصُول اخذ کیئے جن سے اس کے مغلئی رسم و رواج کی تائید ہوتی تھی۔ ابوالفضل فیضی، بیربل اور ٹوڈرمل اس کے استاد و رہنما نہیں تھے۔ علمائے اسلام کو صحیح راہ دکھانے کے اگرچہ مواقع حاصل تھے مگر وہ اپنی انانیت و بے شعوری کی وجہ سے اس کی تسکین نہیں

---

[۱] اکبر کے اس مغلئی نظریہ کو مان لینے کے بعد کیسے کہا جا سکتا ہے کہ بیربل نے اکبر کو آفتاب پرستی کی طرف مائل کیا تھا یا شہ دی تھی۔

کر سکے پھر اپنی ناکامی و بدبختی پر انہوں نے اپنے دل کے جلے پھپولے پھوڑنا شروع کر دیئے۔ اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد اکبری دین الٰہی کا پس منظر وہ نہیں ہو سکتا جس کا نقشہ پروفیسر صاحب محمد اسلم صاحب نے کھینچا ہے۔ بہرحال پروفیسر صاحب نے شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے جس مقولہ کو مہمل قرار دیا ہے وہ یہ ہے "ایں چہ شور است و ایں چہ غوغا کشادہ کسے مومن۔ کسے کافر کسے مطیع کسے عامی کسے درراہ کسے بے راہ کسے مسلم کسے پارسا۔ کسے ملحد کسے ترسا ہمہ در یک سلک است"[۱] اسی مقولہ کی برسبیل تذکرہ حاجی امداداللہ رحمۃ اللہ علیہ نے تائید و تشریح کی ہے کسی شخص نے ان سے بیان کیا کہ ایک بزرگ کہتے تھے کہ تمام آدمی۔ کیا مشرک کیا کافر کیا مومن۔ سب کی خدا تک رسائی ہے۔ اسلام شرط نہیں ہے فرمایا کہ یہ بزرگ باوجود کمال کے سیر اسماء میں تھے۔ البتہ مرتبۂ حقائق میں یہ درست ہے کہ مرجع تمام خلائق کا اللہ جل شانہٗ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ[۲] پر کفایت نہیں کی اور اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کی قید لگا دی مرتبۂ حقائق میں تمام آدمی متساوی الاقدام ہیں[۳] پروفیسر صاحب مندرجہ بالا آیت سورۂ یونس کی آیات نمبر ۱۹ و ۴۷ اور سورۂ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۱۵ پڑھیں تو اعتراض کا عمل ختم ہو جاتا ہے۔ "نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن"۔ حق تو یہ ہے کہ اس مقولہ سے حضرت شیخ کی علویت ثابت ہو جاتی ہے اور اعتراض مہمل ٹھہرتا ہے۔

شیخ العالم کے وصال سے ۳۳ سال بعد حضرت عبدالقدوس رحمۃ اللہ تعالے

---

[۱] مکتوبات قدوسی صفحہ ۵۵

[۲] سورۂ ہود آیت نمبر ۵۶

[۳] امداد المشتاق صفحہ ۴۴ نمبر ۲۰

علیہ گنگوہ میں پیدا ہوتے تھے[1] اور اپنے والد شیخ اسمٰعیل سے ابتدائی تعلیم و تربیت حاصل کی تھی۔ جب وہ بارہ برس کے تھے تو حضرت عارف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا وصال ۸۸۲ھ / ۱۴۷۷/۷۸ء میں ہوا تھا۔ شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے باطنی طور پر شیخ العالم کی روح سے فیض پہلے حاصل کیا اور بعد میں حضرت شیخ محمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے ظاہری بیعت کی خلافت پائی خود لکھا ہے کہ شیخ العالم کے وصال کے چالیس سال بعد پندرہ برس کی عمر میں ان سے روحانی صورت سے فیض حاصل کیا تھا یعنی ۸۸۵ھ / ۱۴۸۰/۸۱ء میں ان کی شادی حضرت عارف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔

بہلول لودی کے عہد میں جب ردولی کے حالات بگڑے تو وہ ۸۹۵ھ / ۱۴۸۹/۹۰ء میں شاہ آباد ضلع انبالہ چلے گئے وہاں سے ۳۸ سال سلسلہ کی اشاعت کی۔ ابراہیم لودی کے مختصر دورِ حکومت میں اور بھی ابتری پیدا ہوئی۔ سلطان اور امراء میں بیحد اختلاف نمایاں ہوئے حضرت شیخ کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ شیخ العالم کے طرز و اصول پر شریعت کے لباس میں طریقت کو بہ حُسن و خوبی پیش کر کے سلسلہ کی توسیع کی اور ہر حال میں پابندی شریعت کی تاکید فرمائی سلاطین وقت کی اصلاح کے لیے انہیں خطوط لکھے۔ اگرچہ وہ عالم و فاضل نہیں تھے مگر صاحب تصنیف تھے۔ ابن عربی کی "فصوص الحکم" پر حاشیہ لکھا۔ وحدت الوجود کی تشریح کی۔ فارسی و ہندی میں اشعار کہے۔ سماع کا بیحد شوق تھا اکثر محویت طاری رہتی تھی۔ ایک مرتبہ محویت میں اپنا چھپر تک اتار پھینکا تھا[2]۔ ابتداً میں سُکر کا اس قدر غلبہ ہُوا کہ دشت و بیاباں میں رہنے لگے مگر مشائخ نے انہیں باز رکھا تاکہ بستی میں رہ کر مخلوق کو فیض پہنچائیں۔ ان کے سماع و محویت پر احتساب کرنے کے لیے حکومت کی طرف سے شیخ حسام الدین المشتہر بہ اودھر بھیجے گئے تھے۔ جب وہ گنگوہ آئے تو اتنے متاثر

---

[1] عبدالقدوس گنگوہی کی تعلیمات مصنفہ اعجاز الحق قدوسی ص ۱۶۸ و ص ۲۹۱

[2] لطائف قدوسی ص ۳۲

ہوئے کہ اپنا کُل اسباب لٹا کر ان کے مرید ہو گئے۔ یہ سُن کر سکندر لودی بھی ان کا معتقد ہو گیا تھا[1]

اس زمانہ میں عجائب پرستی کا زور تھا۔ معقولات کی وجہ سے توحید کی نئی نئی تعبیریں کی جاتی تھیں لہٰذا شیخ گنگوہی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے وحدت الوجود کی صحیح تعلیم کے ذریعے اصلاح کی اور بجائے ورد و وظائف کی مزاولت کے روحانیّت کے اصُول سکھائے اس طرح سلسلہ صابری کی مقبولیّت دیکھ کر حسد کی آگ بھڑک اٹھی اور اعتراضوں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ شاہ آباد سے منتقل ہو کر جب انہوں نے گنگوہ میں سکونت اختیار کی[2] تو مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا مزار پختہ بنوایا اور عرس کی ابتداء کی صابری تعلیم کو جب کُھلے بندوں شیخ العالم نے جاری کیا تو دیگر سلاسل کی طرح یہاں بھی مجاہدات وغیرہ کی مشق کرائی جانے لگی۔ مگر اس فرق کے ساتھ کہ باطنی توجہ کو مؤخر کر دیا گیا۔ شیخ گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے ہزاروں کو مرید کیا اور سیکڑوں کو خلافت سے سرفراز فرمایا۔ ان کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ فراوانیٔ جذبات میں ان کی زبان سے ایسے کلمات نکل جاتے تھے جو ناقابل فہم اور قابلِ اعتراض ہوتے تھے ایسے کلمات کو شطحیات، کہا جاتا ہے اور ان کی گرفت نہیں کی جاتی ہے۔ ان کا وصال شیر شاہ کی فتح دہلی سے تین چار سال پہلے ہمایوں کے اولیں عہد میں ہوا۔ سال وصال ۹۴۴ھ / ۱۵۳۷/۳۵ء ہے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ مقولہ حضرت عبدالقدوس رحمۃ اللہ علیہ کا ہے کہ "من ایں سلسلہ را رنگِ دیگر دادہ ام" صاحب اقتباس الانوار مولانا محمد اکرم نے اسکی تشریح یہ کی ہے کہ انہوں نے جلال و جمال میں اعتدال پیدا کیا تھا لیکن یہ مقولہ نہ شیخ گنگوہی کا ہو سکتا ہے اور نہ وہ ایسا دعویٰ کر سکتے تھے۔ لہٰذا جو تشریح کی گئی ہے وہ بھی غلط ہو گئی جلال و جمال میں اعتدال پیدا کرنا اسلام کی خصوصیت ہے اسکو کسی ولی کی جدت نہیں سمجھا جا سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ صابری سلسلہ کی تجدید کا سہرا شیخ العالم حضرت احمد عبدالحق

---

[1] تکملہ لطائف قدوسی ص ۱۰۹ / ۱۰۱

[2] اس آخری سکونت گنگوہ کی مدت دس سال کے قریب ہے۔

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے سر ہے اس سے کسی کو بھی انکار و انحراف نہیں ہو سکتا۔ اگر "رنگ دیگر" کو شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ سے منسوب کرنا ہی ہے تو اس کا مطلب سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے امراء سے تعلقات رکھنے میں مبالغہ کیا اور وحدت الوجود کی علانیہ اشاعت کی۔ ان کے امراء سے روابط پر اعتراض کیے گئے تھے چنانچہ محمد غوثی نے گلزار ابرار میں اس کی تردید میں پوری قابلیت صرف کر دی ہے۔ مگر صرف اتنا لکھنا کافی ہو سکتا تھا۔ کہ رؤساء سے تعلقات باتباع شیخ العالم کیے گئے تھے۔ چونکہ امراء صاحبانِ اثر ہوتے ہیں اور معاشرے میں انہیں مقام حاصل ہوتا ہے لہٰذا اصلاح معاشرے کے لیے یہ تعلقات ضروری تھے اس وجہ سے وہ سیاست میں حصہ لینے کے لیے مجبور تھے ورنہ یہ حقیقت ہے کہ شیخ گنگوہی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی ابتدائی زندگی میں سیاست و سلطان سے دور رہتے تھے اسی غرض سے سکندر لودی و بابر کو بذریعہ خطوط ہدایات کی ہیں لیکن زمانہ اس قدر بگڑا ہوا تھا کہ اکثر امراء نے ان تعلقات سے فائدہ نہیں اٹھایا ان کی کج فہمیوں کا جو نتیجہ ہونا تھا وہی ہوا بھی۔ یعنی انہیں عزت و دولت سے ہاتھ دھونا پڑا۔

پہلے وحدت الوجود کی تعلیم خواص کو دی جاتی تھی اور وہ بھی صیغۂ راز میں عوام میں اس کے سمجھنے کی اہلیت نہیں تھی جب شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس کو عام کر دیا تو مغالطے پیدا ہوئے نفس پرستوں نے اس کے غلط معنی سے کر مجذوبیت اختیار کی یہ بد قماش معاذ اللہ کبھی خدا بننے کبھی نبوت کے مدعی ہوئے اور وہ ثواب سمجھ کر علانیہ افعال شنیعہ کرنے لگے۔ ان ہی بدعنوانیوں کی وجہ سے وحدت الوجود کی بدنامی ہوئی اور ان ہی لوگوں کی غلط روی کے باعث ابوالفضل و فیضی نے اکبری الحاد کو تقویت پہنچائی جن بدنصیبوں نے وحدت الوجود کا روپ بھر کر عیش پرستی کی اور دنیا کمائی وہ خود اس کے ذمہ دار ہیں۔

ان کی حرکات ناشائستہ کی وجہ سے نہ وحدت الوجود پر حرف آتا ہے اور نہ شیخ عبدالقدوس کو متہم کیا جا سکتا ہے۔ متہم کرنے والے خود وحدت الوجود سے ناآشنا ہیں۔ تاریخ کا برملا اعلان ہے کہ فیروز شاہ کے زمانہ سے بابر کی آمد تک مذہبی وقار میں ناگفتہ بہ کمی آگئی تھی اور نئے نئے فرقے پیدا ہو گئے تھے اس کے بعد جب ہمایوں نے ایرانیوں کی مدد سے دہلی پر دوبارہ قبضہ کیا تو اس کے حلیف اپنے عقائد کی تبلیغ کر کے اور زیادہ ابتری کا باعث ہوئے۔ بہت سے لوگوں نے اپنا مسلک ترک کر کے طمع دنیا کی خاطر سیاست کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور اسی سیلاب میں بہ کر ایرانی مذہب اختیار کر لیا ان جملہ خرابیوں کا سدھار علماء سے زیادہ مشائخ نے کیا ہے۔ اس زمانہ میں یہاں چشتی، سہروردی، قلندری اور قادری سلسلے اپنا کام کر رہے تھے۔ نقشبندی سلسلہ اس وقت تک ہندوستان میں رائج نہیں ہوا تھا۔ یہ چاروں ہی سلسلے وحدت الوجود کے قائل اور مبلغ ہیں۔ وحدت الوجود کے عقیدے کی وجہ سے تنگ نظری و تعصب کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ مشائخ نے اسی نظریہ کے ذریعے دوسری قوموں کے مزاج کو پہچانا۔ ان کی سماجی حالت کو پرکھا۔ پھر اسلام کے اصول ان تک پہنچانے کی کوشش کی۔ چنانچہ اسلام کی ترویج و اشاعت میں وحدت الوجود کو بڑا دخل ہے۔ جب اس کی اشاعت عام کر دی گئی تو افراط و تفریط کی وجہ سے مغالطے اور اختلاف پیدا ہوئے اور اصل تعلیم مسخ ہو گئی حد یہ ہے کہ شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مستند تذکروں میں بھی ایسی روایتیں ملتی ہیں جو عقل سلیم اور حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی شان کے خلاف ہیں۔ یہ روایتیں یقیناً الحاقی ہیں۔ حیرت و افسوس اس بات پر ہے کہ بعض اہل قلم ایسی مہمل روایتوں سے استدلال کر کے ان بزرگوں کے خلاف طبع آزمائی کیا کرتے ہیں۔ مثلاً لطائف قدوسی میں جو ان کے صاحبزادے حضرت رکن الدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی معرکۃ الآراء تصنیف ہے مذکور ہے کہ جب پہلی مرتبہ

اپنی مسجد میں انہوں نے وحدت الوجود کا درس دیا تو صاحبزادگان نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جس پر ناراض ہو کر انہوں نے فرمایا کہ میں ایسے شہر میں نہیں رہنا چاہتا جہاں وحدت الوجود کے منکر ہوں۔[1] پھر یہ بھی اعلان کیا کہ میرا دین اور ہے اور ان کا دین اور ہے۔[2] اسی طرح حضرت جلال الدین تھانیسری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے اس وقت تک ملاقات نہیں کی جب تک انہوں نے وحدت الوجود کے قائل ہونے کا یقین نہیں دلایا۔ یہ عبارت خود بول رہی ہے کہ حضرت کے صاحبزادے رُکن الدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے قلم کی نہیں ہو سکتی۔ خدا کے واسطے کوئی بتلائے کہ ایسے کلمے ان کی شخصیت پر موزوں آسکتے ہیں یا نہیں عقل و اخلاق ان روایات کے روادار نہیں ہو سکتے اور نہ کسی شیخ کامل سے اس قسم کے سلوک کی اُمید کی جا سکتی ہے پھر نہ کسی صاحبزادے یا مرید کی اتنی جرأت ہو سکتی ہے کہ اپنے شیخ سے اس قسم کا انحراف کرے۔ ان روایتوں کو یوں بھی باور نہیں کیا جا سکتا کہ جو شریعت کی پابندی کو اصل شے سمجھتا ہو وہ نہ ایسی ضد کر سکتا ہے اور نہ ایسے شوقیانہ الفاظ اس کی زبان سے نکل سکتے ہیں۔ علاوہ بریں دو تین روایتیں ان کے متعلق اس قسم کی اور بھی پائی جاتی ہیں۔ مثلاً فرمایا کرتے تھے کہ "چتر شاہی بر سرِ طفلان ماست"۔ لیکن انوار العیون میں خود انہوں نے لکھا ہے کہ یہ مصرع شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی زبان پر اس وقت جاری ہوا تھا جب ردولی لُوٹی گئی تھی اندریں صورت بغیر تحقیق و علم کے ان دروغ بافیوں کو تسلیم کرنا اور بغیر مفہوم و عواقب کو سمجھے ہوئے ان کو شہرت دینا شرافت و دیانت سے بعید ہے۔

یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے تعلیم وحدت الوجود

۱؎ لطائف قدوسی ص ۵۹

۲؎ لطائف قدوسی ص ۴

کو سب سے پہلے عام کیا تھا۔ ان سے پہلے دیگر سلاسل کے بزرگوں نے اس کا درس دیا ہے۔ ان کے اسماء گرامی یہ ہیں: شیخ علی مہائمی، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری اور شیخ حسن طاہر وغیرہم رحمۃ اللہ علیہم اجمعین حضرت یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ذاتی تجربہ سے ثابت کیا ہے کہ "عام طور پر جس کو وحدت الوجود غیر حق کا عدم محض یا فنائے کامل سمجھا جاتا ہے وہ درحقیقت وجودِ حقیقی کے سامنے دوسرے موجودات کا اس طرح ماند پڑ جانا اور مغلوب ہو جانا ہے جس طرح آفتاب کی روشنی کے سامنے ستاروں کی روشنی ماند اور ذات کا وجود بے حقیقت ہو جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر یُوں بھی تشریح فرمائی ہے کہ کسی چیز کا نابود و معدوم ہو جانا اور چیز ہے اور نظر نہ آنا اور چیز ہے لہٰذا یہ غلط ہے کہ بندہ خدا ہو گیا یا یہ کہ بندہ معدوم ہو گیا۔ جب تم آئینہ دیکھتے ہو تو آئینہ کو نہیں دیکھتے بلکہ اپنی صورت کو دیکھتے ہو۔ اس کا مطلب یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ آئینہ معدوم ہو گیا" اس کے علاوہ کلمہ طیب و کلمہ شہادت پر ایمان رکھنے والے اور اللہُ اکبر کا ورد کرنے والے خواب میں بھی نہیں کہہ سکتے کہ بندہ خدائی کا مرتبہ حاصل کر سکتا ہے۔ اہل ظاہر کے نزدیک خدا سلسلہ کائنات سے الگ جداگانہ ذات ہے مگر صُوفیہ سلسلہ کائنات سے خُدا کو جدا نہیں سمجھتے وحدت الوجُود کے ابتدائی مبلغ نظامی گنجوی۔ حکیم سنائی۔ فریدالدین عطار۔ ابن رشد گازرونی اور نابلسی تھے۔ ابن عربی۔ امام غزالی اور امام رازی نے اسی کی تشریح کی ہے۔

حضرت شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے وصال کے اڑتیس سال بعد اکبر نے سنہ ۹۲۸ھ / ۱۵۷۵ء میں عبادت خانہ کی طرح ڈالی تھی اس میں علماء کی نفسانیت و ناشائستہ حرکات کی وجہ سے لادینی کا جملہ فتنوں نے اکبر کے دینِ الٰہی کی صورت اختیار کر لی تھی۔ صوفیہ خام نے اپنے مفاد کی خاطر شریعت کو طریقت سے علیحدہ کر دیا تھا اور طریقت کے نام سے کفر و شرک کے شعبدے دکھائے جاتے تھے۔ ان فتنوں اور اکبری الحاد کی مدافعت چشتیوں میں حضرت جلال

تھانیسری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (متوفی ۹۸۹ھ/۱۵۸۱ء) شیخ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (متوفی ۹۷۵ھ/۱۵۶۷/۶۸ء) اور اُن کے صاحبزادے حضرت قطبِ عالم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اور قادریوں میں حضرت موسیٰ گیلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ و شاہ ابوالمعالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کی۔ اکبر کے زمانۂ آخر میں حضرت باقی باللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ماوراالنہر سے ہندوستان تشریف لائے تھے انہوں نے یہاں سلسلہ نقشبندیہ کی سب سے پہلے اشاعت فرمائی[1] یہ سلسلہ سب سے قدیم ہے مگر ہندوستان میں سب سے آخر میں جلوہ فرما ہوا۔ حضرت باقی باللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پہلے لاہور میں نواب مرتضیٰ خاں فرید بخاری ناظم لاہور (متوفی ۱۰۲۶ھ/۱۶۱۶ء) کے مہمان ہوئے پھر دہلی میں حضرت قطبِ عالم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی چشتی خانقاہ میں قیام فرمایا۔ ان کے ابتدائی مریدوں میں نواب فرید بخاری، خان خاناں، مرزا نظام الدین احمد بخشی اور شیخ عبدالحق محدّث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ہیں۔ شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے حجاز سے واپس آکر ۱۰۰۱ھ/۱۵۹۲/۹۳ء میں حدیث کا مدرسہ دہلی میں جاری کیا تاکہ الحاد و لادینی کی مدافعت ہو۔ مسلمانوں کی اصلاح کی کوشش حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور ان کے مریدوں نے خوبی و مستعدی سے کی۔ اس زمانہ میں عام طور پر شریعت کو طریقت سے علیحدہ سمجھا جاتا تھا۔ خواجہ صاحب نے اس کی تردید کی۔ وحدت الشہود کی اشاعت فرمائی اور اکبر کے دینِ الٰہی کی مدافعت اپنے مختصر قیام میں بڑے کمال کے ساتھ کی مگر ان کا وصال اکبر کی حیات میں قیامِ دہلی کے چھ سات سال بعد ۱۰۱۲ھ/۱۶۰۳ء میں ہو گیا۔ لہٰذا وہ خود اپنی تعلیم و تبلیغ کو زیادہ عرصہ جاری نہ رکھ سکے ان کے وصال سے ایک سال پہلے ۱۰۱۱ھ/۱۶۰۲ء میں ابوالفضل قتل کیا جا چکا تھا۔ حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۰۳۴ھ/۱۶۲۴/۲۵ء) اپنے والد کے وصال کے دوسرے سال

---

[1] حضرت باقی باللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کابل میں ۹۷۱ھ/۱۵۶۴ء میں تولد ہوئے تھے۔

۱۰۰۸ھ/۱۵۹۹/۱۶۰۰ء میں خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں بمقام دہلی حاضر ہوئے تھے۔ بیعت کے بعد مقاماتِ سلوک طے کئے اور خواجہ صاحب کے وصال سے کچھ پہلے خلافت پائی۔ گویا مرشد کی خدمت و صحبت میں چار پانچ سال گزارے۔ پھر سرہند میں اکبر کی وفات تک مریدوں کی تعلیم و تربیت میں مصروف رہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اکبر کا عہد ان کی مجدّدیت کی طیاری کا زمانہ تھا۔ خواجہ صاحب نے ان کے متعلق عظیم الشان بشارتیں دی تھیں۔ اپنے حلقۂ توجہ میں ان کو سرِ حلقہ بنا کر بٹھالا اور مریدوں کو حکم دیا کہ ان کی موجودگی میں کوئی شخص میری طرف متوجہ نہ ہو۔ مجدد صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ابتدا میں ظاہری و باطنی تعلیم اپنے والد سے پائی تھی اور ان سے فوائدِ باطنیہ کثیرۃً بقول خود حاصل کئے تھے اور یہ وہی حضرت شیخ العالم ردولوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی تعلیم تھی غالباً اسی تعلیم کے اثر کو دیکھ کر خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مجدد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پر زیادہ توجہ فرمائی اور اپنا خلیفۂ اعظم بنایا۔ اکبر کے انتقال ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵/۱۶۰۶ء کے بعد جہانگیر کی تخت نشینی پہ انہوں نے اپنا اصلاحی کام شروع کیا۔ اکبر کے دینِ الٰہی کے اثرات ختم کر دینے کا سہرا یقیناً ان ہی کے سر ہے۔ اکبری عہد کے صوفیہ جو وحدت الوجود کے قائل تھے وہ صرف زبانی جمع خرچ کرتے تھے اور جُہلاء غلط استعمال سے قبیح حرکات کے عادی ہو گئے تھے۔ لیکن جو لوگ شیخ اکبر سے واقعی متاثر تھے وہ زہد و تقویٰ کے میدان میں پیش پیش تھے لہٰذا ان بطّال صوفیوں اور ان مقدس حضرات میں امتیاز کرنے کی ضرورت ہے۔ سب کو ایک نظر سے دیکھنا درست نہیں۔ حضرت مجدد علیہ الرحمۃ نے ان بطّال صوفیوں کی اصلاح، تعلیم وحدت الشہود سے کی۔ اور ساتھ ہی نقشبندیوں میں جو بدعات اس قلیل عرصہ میں رائج ہو گئی تھیں ان کو بھی دور کیا۔ جیسا کہ مکتوب نمبر ۱۳۱ سے معلوم ہوتا ہے ترویج شریعت پر اپنے والد اور اپنے مرشد کے مطابق زور دیا ہے تاکہ جذبات و کیفیات میں

کوئی حرکت شریعت کے خلاف نہ ہونے پائے۔

وحدت الشہود کی تعلیم علاء الدین سمنانی کی ایجاد کردہ ہے ابنِ تیمیہ نے اسے پروان چڑھایا۔ اور عبدالوہاب نجدی نے اسے شہ دی۔ وحدت الشہود کے مسئلہ میں مجدد رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ کلی طور پر نجدیوں سے متفق نہیں ہیں ان کے وحدت الوجود اور وحدت الشہود کا اختلاف تو وہ محض لفظی و اصطلاحی ہے۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پر نقشبندی نسبت کا غلبہ تھا ورنہ وحدت الوجود کے منکر یا مخالف نہیں تھے بلکہ خود اس کے ماہر تھے۔ انہوں نے اپنے والد اور شاہ سکندر کیتھلی قادری سے وحدت الوجود کی تعلیم پائی تھی۔ چنانچہ جب تیسری مرتبہ حضرت باقی باللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے یہاں سے سرہند واپس آئے یعنی خواجہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے وصال کے بعد تو بہت سے لوگ ان کے حلقہ ارادت میں شامل ہوئے۔ اسی زمانہ میں مولانا جمال تلوی نے جو منکر وحدت الوجود تھے مجدد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے وحدت الوجود کے متعلق استفسار کیا تھا۔ تو "شیخ سرگوش مولانا بردہ کلمہ چند فرمودند"۔ یعنی کان میں چپکے سے وحدت الوجود کی تشریح فرما دی۔ مولانا تلوی رونے لگے اور اس درجہ متاثر ہوئے کہ مرید ہو گئے حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ان کی بہت قدر کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ مجدد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا احترام کرتے تھے اور ان کا ذکر انہوں نے "زبدۃ المقامات" میں ادب کے ساتھ کیا ہے۔ حضرت کے خلیفہ حسن برکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنے مکتوب میں اصطلاح صوفیہ پر اعتراض کئے تھے۔ وہ حضرت کو ناگوار ہوئے اور جواب میں لکھا کہ "خبردار بے سمجھی سے ایسی باتیں آئندہ نہ کرنا۔ اور غیرتِ خداوندی سے ڈرتے رہنا شاید تم کو نقلی و جعلی صوفیوں نے برانگیختہ کیا ہوگا۔۔۔۔ مگر بزرگوں کا خیال رکھنا چاہیئے۔۔۔ مدعیانِ طریقت کی بدعات پر نکتہ چینی کرو تو اس کی گنجائش ہے اور وہ بالکل

ٹھیک ہے۔ لیکن جو چیزیں صوفیہ میں مقرر و ضروری ہیں ان پہ کلام کرنا سخت نامناسب بات ہے[1]"۔ وحدت الوجود کے منازل اور وحدت الشہود کے مدارج۔ اصطلاحوں کے فرق کے علاوہ کم و بیش ایک ہی ہیں۔ مجددیوں کے یہاں جس آخری منزل کا نام "قیومیت" ہے اس کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ پروفیسر غلام مصطفٰے صاحب نے (جو اس کے ماہر ہیں) اپنی کتاب مجدد الف ثانی، کے صفحہ ۸۱ و ۸۲ پر قیومیت کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "قیومیت" ولایت کا ایک بلند مرتبہ ہے جب ولی اس مقام پر فائز ہوتا ہے تو اس کے افعال اللہ سے منسوب ہو جاتے ہیں نہ اس کی سماعت رہتی ہے نہ دید۔ نہ اس کی گرفت رہتی ہے نہ حرکت اس وقت

"وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ رَمٰى ۔ إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللّٰهَ۔

کے اسرار" واضح ہو جاتے ہیں"۔ زبدۃ المقامات میں قیومیت کی وضاحت جو کی گئی ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ

(۱) - اس عالم میں پروردگار جل شانہ کا خلیفہ و نائب قیوم ہے۔

(۲) - عالم کے تمام افراد کے لیے جو اسماء و صفات کے مظاہر و ظلال ہیں ایک ایسی ہستی و وجود کی ضرورت ہے جو تجلیات ذاتیہ سے بہرہ مند ہو تاکہ اس کا قیام اس سے ہو۔

(۳) - ایسی برگزیدہ ہستی کا وجود نئی بات نہیں اِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً کے مطابق ایسا فرد کامل ہوتا چلا آیا ہے یہی سنتِ الٰہی ہے۔

(۴) - جو بھی اس مبارک مقام پر فائز ہوتا ہے وہ قبلۂ عالمیان اور سردارِ اقطاب و افراد و

۱؎ منقول از تذکرہ مجدد الف ثانی مصنفہ مولانا منظور احمد نعمانی صاحب صفحہ ۳۴۲

ابدال واوتاد ہوتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ ولایت کے لیے خشیت و تقویٰ کی ضرورت ہے نہ کہ کشف و کرامات کی۔ اب اگر وجودیوں کی انتہائی معراج پر غور کیا جائے تو اس کی تفصیل ہو بہو وہی ہے جو قیومیت کی ہے دونوں کا استدلال اسی آیت پاک پر ہے جس کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے۔ وجود کے معنی اگر وجد کے لیے جائیں تو دونوں مکتب خیال ایک ہو جاتے ہیں۔ اور وجودیوں اور شہودیوں میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ لیکن اگر وجود سے موجود کا مطلب لیا جائے تو دونوں میں اختلاف ہو جاتا ہے۔ وجودی کہتے ہیں کہ کلمۂ طیب کا مفہوم یہی ہے کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے نہ کوئی معبود ہے، نہ مقصود ہے اور نہ موجود ہے اس طرح اللہ جل شانہٗ کی انفرادیت کے ساتھ عالم کا وجود خود ثابت ہو جاتا ہے۔ یعنی یہ کہ عالم محض مظہر حق ہی نہیں ہے۔ بلکہ عین حق بھی ہے۔ زمین و آسمان کی تخلیق حق سے ہے اور خدا کا مشاہدہ خارجی عالم اور انسانی ذات دونوں میں ہو سکتا ہے۔ گویا انفس و آفاق حق تعالیٰ کی نشانیاں ہیں اس لیے ان سب کا وجود عین حق جلّ مجدہٗ کا وجود ہے لیکن ہر شئے بذات خود خدا نہیں ہو سکتی۔ نوعیت اصل ہے اور تنوع اس کا مظاہرہ ہے۔

وحدت الوجود کا بنیادی اصول بس یہی ہے۔ وجدان کا تعلق عالم غیب سے ہے۔ وجود و شہود کا صحیح مطلب کشود کے ذریعے ہی سمجھا جا سکتا ہے ورنہ یہ سب سخن آرائی ہے۔ منطق و فلسفہ کو اس کی ہوا بھی نہیں لگی ہے اور نہ وہ واضح کر سکتے ہیں۔ وحدت الوجود یعنی ہمہ اوست توحید صفاتی ہے اور وحدت الشہود یعنی ہمہ از وست توحید فعلی ہے۔ حضرت مجدّد سرہندی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ذات اور وجود میں ظل اور اصل کے مدعی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی صفات میں بھی اصلیّت و ظلّیت کے قائل ہیں۔ ظل کے معنی خواہ سایہ کے لیے جائیں خواہ لطائف مبارکہ کے سمجھے جائیں ہر دو صورت میں دوئی یا ثنویت پائی جاتی ہے۔ لیکن وجودی جس

وجود کو عینِ ذات سمجھتے ہیں اس میں اصل و ظِل کی شرط نہیں لگاتے اور وہ صفات کو بھی غیر ذات سمجھتے ہیں۔ ان دونوں کے لفظی اختلاف و فرق میں حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے سمجھوتہ کرایا ہے۔ فرماتے ہیں کہ "کفرِ شریعت دو معبود پنداشتن است و کفر حقیقت دو موجود دانستن است یعنی صُوَرِ علمیہ ما متحقق اند۔ و آں ہمہ علم ماست کہ بہ چند رنگ آمدہ شبہ نیست کہ ایں صُوَر را عین علم نتواں گفت۔ زیرا کہ ایں تلوّنات را قیوم و منشاء بُوَد"[1] اس طرح انہوں اختلاف و تضاد کو ختم کر دیا ہے۔ خداوند کریم حضرت مجدد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے درجات میں زیادہ سے زیادہ روز افزوں ترقی فرمائے۔ ان کا وصال ۶۳ سال کی عمر میں ۱۹ صفر ۱۰۳۴ھ / ۲۵ / ۱۶۲۴ء کو ہوا۔ وصال سے کچھ پہلے اجمیر شریف تشریف لے گئے تھے۔ چاہتے تھے کہ جہانگیر کے لشکر کی اصلاح کو ختم کر کے بقیہ عمر سکون کے ساتھ وطن میں گزاریں۔ اسی غرض کے لیے حضرتِ غریب نواز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مزار پاک پر مراقبہ کیا تھا "مدتے مجازی آں صدرِ اولیاء مراقب نشستند"، روحانی ہدایت ہوئی کہ "در خلاصی خود از یں عسکر سعی نہ کنند"، یعنی لشکر میں تبلیغ و اصلاح کا کام جاری رکھیں۔ جب باہر آئے تو خدام نے غلاف مزاران کی نذر کیا۔ انہوں نے اسے لیکر بہ حفاظت تمام اپنے کفن کے لیے رکھ لیا۔ عجب کوائف ہیں۔ مجدد علیہ الرحمۃ کی ابتدائی تعلیم طریقۂ چشتیہ میں ہوئی۔ پھر سلوکِ قادریہ کی تعلیم پائی، اس کے بعد نقش بندیہ میں وہ کمال حاصل کیا کہ مجددِ مشہور ہوئے اور آخری حقیقت یہ ہے کہ حضور غریب نواز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے ہدایت و انعام حاصل کیے۔ معلوم ہوا کہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود دونوں ایک ہیں۔ مخالف سمتوں سے نہیں بلکہ ایک ہی سمت سے دونوں مختلف جگہوں پر کھڑے ہوئے منظرِ آفتاب سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ یہ مَن و تو کا قضیہ پر منکتے جہالت ہے اور بس۔

---

[1] انفاس العارفین صہ ۸۲

قصہ مختصر اس سے انکار ممکن نہیں کہ حضرت عبدالقدوس رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کے بعد صابری سلسلہ کی مرکزیت جاتی رہی تھی۔ پھر ڈیڑھ سو سال بعد امروہہ میں مرکزیت کا اعادہ ہوا اور وہ ۱۶۸ سال قائم رہی۔ آخر میں ۸۵۶ھ ۱۴۵۲ء کے بعد حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مرکزیت کو بحال کرنا چاہا مگر ان کے خلفاء اسے نہیں نبھاہ سکے۔ خود ان میں تفرقہ پڑ گیا۔ لہٰذا معاشرے میں ابتذال پیدا ہونا لابُد تھا جو ہو کر رہا۔ البتہ شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ علیہ کے بعض خلفاء نے انفرادی طور پر جو خدمت کی تھی وہ مرکز کی کارگذاریوں سے کم اہم نہیں خیال کی جاسکتی۔ انہوں نے ہندوستان سے باہر جا کر یہاں کے جملہ سلاسل سے پہلے اپنے سلسلہ کی اشاعت کی۔ حضرت نظام الدین بلخی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور شیخ محمدی رحمۃ اللہ علیہ کے کارناموں سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت عبدالقدوس رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے خلفاء کی یہ خصوصیت و حقیقت بھی قابل ملاحظہ ہے کہ اپنے شیخ کے اتباع میں حالاتِ زمانہ کے مدنظر انہوں نے امراء و سلاطین سے ربط وضبط کو مناسب نہیں سمجھا[1] لوگوں نے اراضی کا قبضہ طے کرنے کو جلال الدین تھانیسری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو آگرہ بلایا تھا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے "رسالہ تحقیق اراضی ہند" تصنیف کیا تھا جس میں ثابت کیا ہے کہ بادشاہ کو اختیار ہے کہ جس کو چاہے زمین دے۔ پھر وہ اس کا حق ہو جاتی ہے۔ اکبر بادشاہ کو وہ بہت پسند آیا اور ان سے اپنے یہاں رہنے کے لیے بیحد اصرار کیا۔ مگر وہ راضی نہیں ہوئے اور تبلیغ سلسلہ کی غرض سے وطن چلے آئے۔ ان کی توجہ بجائے امراء کے عوام کی اصلاح کی طرف رہی اور یہ زمانہ اسی کا مقتضی تھا۔

۱؎ مرشد سے یہ اختلاف ایسا تھا کہ جیسا امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے شاگردوں کے درمیان میں تھا اور ویسا نہیں تھا جیسا کہ آگے چل کر حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خلفاء کے درمیان ہوا۔

حضرت جلال الدین تھانیسری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ابتداء میں زاہد خشک تھے اور سماع کے قطعی مخالف تھے۔ شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مریدوں سے کہا کرتے تھے کہ تمہارا پیر ٹچکیّا ہے۔ حضرت نے جواب میں کہلا بھیجا کہ عبدالقدوس محض رقاص ہی نہیں ہے بلکہ رقاص گر بھی ہے۔ جب حضرت شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ علیہ تھانیسر پہنچے اور مولانا کے مدرسے میں تشریف لے گئے تو اپنے جواب کو سچ کر دکھایا۔ مولانا ایک نظر کی تاب نہ لا سکے۔ لوٹ پوٹ ہو گئے اور حال بدل گیا۔ بہر حال بیعت سے مشرف ہوئے اور خلافت کے مستحق ٹھہرے اکبر کے دینِ الٰہی سے انہیں سابقہ پڑا۔ اکبر کا دربار فلسفہ و حکمت سے معمور تھا۔ اکبر نے یہ سُن کر کہ غیاث منصور ایرانی کے ایک شاگرد فتح اللہ شیرازی بیجاپور میں ہیں وہاں کے نواب عادل خاں دکھنی سے ان کو طلب کیا چنانچہ وہ فتح پور سیکری آگئے۔ وہ مذاہب امامیہ رکھتے تھے اکبر نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہ نیرنجات کے بھی ماہر تھے۔ ان کی نئی نئی ایجادیں اور شعبدے مشہور ہیں اس عہد میں انہوں نے معقولیت و شیعیت کو خوب پروان چڑھایا پھر پارسی حکیم کامران نے فلسفہ مشائین کو رائج کیا۔ اس نے اپنی کتاب دبستان المذاہب میں جملہ مذاہب کا خواب مضحکہ اڑایا ہے۔ اکبر کے دینِ الٰہی کے خلاف بنگال و بہار میں بغاوتیں بھی ہوئیں مگر وہ حکومت کے تشدد کی وجہ سے دب کر رہ گئیں۔ اکبر کا دینِ الٰہی کچھ بھی ہو مگر تھا بے حقیقت اس کو ملکی مصلحت ہی تصور کیا جاسکتا ہے۔ وہ اس قابل نہیں کہ اس پر کوئی خاص توجہ کی جائے۔ یہ دربار کے چند جاہ طلبوں تک ہی محدود رہا۔ صرف نو یا دس چیلے یا مرید میسر آسکے ان کے سوائے بیربل کے باقی سب مسلمان تھے۔ اس نو ایجاد فرضی مذہب کے علاوہ اس زمانہ میں خود ہی الحاد کا زور تھا۔ علمائے دربار گندم نما جو فروش تھے ان سے بیزار ہو کر اپنے مغلئی رسم و رواج اور جلگیر خاں تقلید میں اکبر نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ اس کے انتقال

کے بعد اس کا دین الٰہی دم توڑ گیا۔ پھر حضرت مجدد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس دین کے اثرات بھی زائل کر دیئے۔ ملا ئے بدایونی چودہ برس اکبری دربار میں رہے۔ اس مذہب کی انہوں نے تائید نہیں کی۔ سزا کے خوف سے تین مرتبہ گھر بیٹھ رہے مگر ہر مرتبہ کسی نہ کسی طرح بُلا لیے گئے مگر حیرت ہے کہ ایسے ماحول میں رہنا انہوں نے پسند کیسے کیا۔ راجہ مان سنگھ۔ شہباز خاں کمبوہ اور قطب الدین محمد[۱] نے اس مذہب کو قبول کرنے سے اکبر کے منہ پر صاف انکار کر دیا مگر اپنے اپنے عہدوں پر بحال رہے اور معتوب نہیں کیے گئے۔ مدعا یہ کہ اکبر کو خود اس مذہب پر اصرار نہیں تھا۔ وہ سیاسی طور پر مصلحتاً صلح کل ہونے کے خیال سے اپنے اثرات کو بڑھا کر اپنی حکومت کا استحکام چاہتا تھا۔ اور بس۔

حضرت مجدد سرہندی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سلسلہ چشتیہ میں اپنے والد کے مرید تھے پھر قادری خلافت شاہ کمال کیتھلی سے حاصل کی تھی۔ آخر میں سلسلہ نقشبندیہ کے مجدد ہوئے۔ لہٰذا ان کی تعلیم میں ان دونوں سلسلوں کی خُوبُو پائی جاتی ہے۔ اسی حقیقت کو باندازِ دگر "نظامِ تعلیم و تربیت" کے صفحہ ۲۰۳ پر مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے لکھا ہے کہ "اور تو اور سیدنا الامام حضرت مجدد سرہندی قدس سرہٗ نے حالانکہ جو کچھ لکھا ہے عقلیت کے خلاف ان کا سارا کلام جیسا کہ پڑھنے والوں پر مخفی نہیں سراسر عقلی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے"۔ اگر مولانا مرحوم ذرا بھی غور فرماتے تو سمجھ لیتے کہ مجدد صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ حضرت شیخ العالم ردولوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی طرح طریقت کو شریعت کے لباس میں پیش کرتے تھے۔ لہٰذا عقلیت کی تردید عقل سے اس لیے کی کہ لوہا لوہے کو کاٹا کرتا ہے۔ اگر طریقت کے اصول پر تردید فرماتے تو عقلیت والے اسے کیا سمجھتے۔ چونکہ صابری اور مجددی طرزِ تعلیم ایک سا ہے اسی لیے مجددی حضرات مخدوم

[۱] پتہ نہیں کہ یہ قطب الدین کوکہ تھے یا کوئی اور تھے۔ منتخب التواریخ میں یہی نام لکھا گیا ہے۔

پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور ان کے سلسلہ کا خاص طور پر احترام کیا کرتے ہیں۔

نظام الدین بلخی تھانیسری (متوفی ۱۰۳۶ھ/۱۶۲۶/۲۷ء) حضرت جلال تھانیسری کے بھتیجے داماد اور خلیفہ تھے۔ جہانگیر کو ان سے عقیدت تھی مگر اس شبہ پر کہ انہوں نے باغی شہزادہ خسرو کو پناہ دی تھی بادشاہ نے ان کو جلاوطن کر دیا تھا۔ وہ حرمین شریفین کی زیارت کے بعد بلخ میں مقیم ہو گئے تھے۔ انہی کا دم ہے کہ اس دیار میں صابری سلسلہ کی اشاعت کی ان کا وصال بلخ میں ہوا۔ وہیں مدفون ہوئے ان کے خلیفہ حضرت محب اللہ الہ آبادی صابری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (متوفی ۱۰۵۸ھ/۱۶۴۸ء) نے ہمیشہ امیروں سے بے نیازی برتی۔ شاہجہاں نے ہر چند انہیں بلایا مگر انہوں نے معذرت کر لی۔ البتہ اپنے قیام الہ آباد میں شہزادہ دارا شکوہ ان سے فیضیاب ہوا تھا اور سفینۃ الاولیاء میں اس نے اس کا ذکر بھی کیا ہے اورنگ زیب کو حضرت محب اللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے کچھ پرخاش تھی۔ ان کے خلیفہ شاہ محمدی امروہوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (متوفی ۱۱۹۷ھ) کی جب شہرت ہوئی تو اورنگ زیب نے اپنی خام خیالی کی وجہ سے انہیں مکہ شریف چلے جانے کا حکم دیا۔ وہاں انہوں نے صابری سلسلہ کی اشاعت ملک رُوم تک کی۔ ۱۰۹۹ھ/۱۶۸۷/۸۸ء کے بعد جب وہ واپس آئے تو پانچ سال تک انہیں قلعہ اورنگ آباد میں قید رکھا گیا۔ پھر اکبر آباد میں ان کا وصال ہوا۔ ان کے خلیفہ شاہ عضد الدین امروہوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (متوفی ۱۱۷۲ھ/۱۷۵۸/۵۹ء) کو ان کی تصنیف "مقاصد العارفین" پر روہیلہ نواب نے انعام و وظیفہ پیش کیا مگر انہوں نے قبول نہیں کیا اور متوکل رہے ان کی پیشین گوئی کے مطابق مدت بعد شاہ عالم کے مرہٹوں نے ۱۱۸۵ھ/۱۷۷۱/۷۲ء میں ضابطہ خاں روہیلہ کو شکست دی تھی۔ شیخ المشائخ حضرت عبدالباری امروہوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ، شاہ عضد الدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے خلیفہ تھے۔ ان کا وصال ۱۲۲۶ھ/۱۸۱۱ء میں ہُوا۔ شاہ عبدالباری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے خلیفہ حاجی عبدالرحیم فاطمی ولایتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تھے۔

ان صابری حضرات کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صاحبان سرکار و دربار سے بے تعلق رہے۔

سلطنت مغلیہ کے زوال اور انگریزوں کے عروج کی داستان سے تاریخ بھری ہوئی ہے۔ مگر ان ہنگاموں میں صابری بزرگوں کی کسی نوعیت سے بھی شرکت و شمولیت نہیں پائی جاتی البتہ حضرت عبدالباری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے وصال کے بعد ان کے خلیفہ حاجی عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ سیاسی طور پر نہیں بلکہ علماء کے فتوی کی بناء پر سید احمد بریلوی کے ساتھ سکھوں کے خلاف جہاد میں شریک ہو گئے تھے۔ اور ان کی شہادت بالاکوٹ میں ہوئی تھی ان کے بعد حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں سے برسرپیکار ہوئے تھے۔ حاجی عبدالرحیم فاطمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے متعلق سید احمد رائے کے خلفاء نے نہایت وثوق سے فخریہ اعلان کیا ہے کہ حضرت فاطمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو رحم علی شاہ قادری سے فیض حاصل نہیں ہوا اور نہ شاہ عبدالباری امروہوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے خلافت ملی بلکہ بلا شرکتِ غیرے وہ سید احمد صاحب رائے بریلوی کے خلیفہ تھے۔ گویا وہ نقشبندی تھے[1] اگر یہ صحیح ہے تو حاجی عبدالرحیم اور ان کی شاخ کا تعلق صابری سلسلہ سے کبھی ہرگز نہیں ہو سکتا اور ان کو حق نہیں کہ اپنے آپ کو صابری مشہور کریں، مگر خدا جانے یہ لوگ نقشبندی بننے سے کیوں شرماتے ہیں۔ "شمائم امدادیہ" کے صفحہ ۱۶۳ پر ایک روایت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مشہور شاعر مومن خاں مومنؔ سے نقل کی ہے[2] کہ ایک روز شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

[1] حضرت فاطمی کے سید احمدی ہونے کا دعویٰ حسب ذیل کتب میں ہے۔ (۱) مخزن احمدی (۲) سوانح احمدی (۳) ارواح ثلاثہ (۴) سوانح قاسمی (۵) "سید احمد شہید" مصنف مولانا غلام رسول مہر صاحب۔ وغیرہ

[2] یہی روایت "امداد المشتاق" میں بھی ہے۔

نے اکابر دین کا تذکرہ کرتے ہوئے مردان کامل کا ذکر کیا تھا۔ ایک شاگرد نے عرض کیا کہ آجکل مردِ کامل نظر نہیں آتے۔ فرمایا کہ "پرسوں فلاں سمت سے فلاں وقت ایک شخص مسئلہ پوچھنے یہاں آئے گا اسے دیکھ لینا وہ مرد کامل ہے۔" چنانچہ موعودہ وقت پر جو صاحب آئے وہ حضرت حاجی عبدالرحیم فاطمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تھے۔ مرد کامل نے اس طرح مرد کامل کو دکھا دیا اب ملاحظہ ہو کہ شاہ عبدالباری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا وصال ۱۲۲۶ھ (۱۸۱۱ء) میں ہوا اور ان کی وصیت کے مطابق صاحبزادے کی تعلیم و تربیت کے لیے حاجی عبدالرحیم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ دو برس تک امروہہ میں رہے۔ لہٰذا شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی خدمت میں وہ یا تو اس دو برس کے دوران میں آئے یا ۱۸۱۱ء کے بعد آئے۔ سید شہیدؒ اس زمانہ میں نواب امیر خاں کے لشکر میں بمقام مالوہ تھے[1] وہاں سے دہلی آنے پر انہیں شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے خلافت ۱۸۱۸ء میں دی تھی۔ سید صاحب کی پہلی ملاقات ان کے تذکروں کے مطابق حضرت فاطمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے سہارنپور کی بونبی والی مسجد میں ہوئی تھی جب کہ تبلیغی دورہ کے سلسلہ میں سید صاحب وہاں گئے تھے نتیجہ یہ کہ جب حضرت فاطمی مسئلہ دریافت کرنے شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے تو وہ مرد کامل تھے اور سید احمد صاحب اس وقت نواب امیر خاں کے لشکر میں محض معمولی سپاہی تھے اور شاہ صاحب سے انہیں خلافت بھی نہیں ملی تھی۔ لہٰذا حضرت فاطمی کا

[1] مالوہ کے لشکر میں ہر افسر نواب کہلاتا تھا ورنہ واقعی نواب کوئی نہیں تھا۔ نواب اشرف علی خاں رئیس کمونہ ضلع علی گڑھ نے اپنے تذکرے "اشرف نامہ" میں لکھا ہے کہ وہ اسی زمانہ میں نواب امیر خاں کے مہمان مختلف وقفوں میں تین مرتبہ عرصہ تک رہے ہیں اور وہ فقیر دوست بھی تھے۔ مگر انہوں نے سید صاحب کا نہ ذکر کیا ہے اور نہ ان سے ان کی ملاقات ہوئی لہٰذا یہ سخت حیرت کی بات ہے۔ یعنی اگر سید صاحب وہاں تھے تو گمنام و بے نشان تھے۔

کمال سید احمد صاحب کا عطیہ کبھی ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس لیے حضرت فاطمی کے متعلق سید صاحب کے خلفاء اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے خلفاء کا دعویٰ غلط اور مہا غلط ہے۔ حاجی صاحب کی ایک روایت سے اس دعویٰ کی تردید ہو جاتی ہے اور وہ روایت امداد المشتاق کے صفحہ نمبر ۲۸۳ پر ہے جو انہوں نے زیارت حرمین کے موقع پر ۱۲۶۱ھ / ۱۸۴۵ء میں سُنی تھی وہ یہ ہے کہ شاہ عبدالرحیم اور شیخ محمد جان نے ہندوستان آ کر پہلے حضرت رحم علی شاہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے سلسلہ قادریہ میں بیعت کی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد یہ دونوں امروہہ پہنچے۔ شاہ عبدالباری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا کہ "شیخ محمد جان سے کہہ دو کہ تمہارا حصہ شاہ غلام علی دہلوی کے پاس ہے اور شاہ عبدالرحیم کو میرے پاس لاؤ" اس کے بعد شاہ عبدالباری رحمۃ اللہ علیہ سے فاطمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا مطلب پورا ہو گیا۔ یعنی مرید کر کے توجہ فرمادی۔ حاجی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی اس مستند روایت کا علم رکھنے کے بعد معلوم نہیں ان لوگوں کو کیا خبط و جنون ہے جو فاطمی رحمۃ اللہ علیہ کو سید "شہید" صاحب کا خلیفہ کہتے ہیں غالباً ایسا شبہ حضرت فاطمی کی شرکت جہاد کی وجہ سے ہوا۔ انہوں نے بیشک سید صاحب سے بیعتِ جہاد کی مگر بیعتِ جہاد اور بیعتِ ارادت میں فرق ہے۔ ممکن ہے کہ سید صاحب نے اپنی اعزازی خلافت بھی مرحمت فرمادی ہو۔ اگرچہ اس کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ مگر یہ بھی بیعتِ ارادت کا مرتبہ نہیں رکھتی۔ سلسلہ اصلی سے چلا کرتا ہے۔ پھر یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ سید صاحب نے جہاد محض سکھوں سے کیا تھا یا انگریزوں سے بھی کیا تھا۔ واقعات حالات اور خصوصاً سید صاحب کے بیانات سے ظاہر نہیں ہوتا کہ انہوں نے جہاد انگریزوں سے کیا تھا۔[1] اسی طرح حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا جہاد انگریزوں کے خلاف مشکوک ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ یہ اتباع سید احمد صاحب ان کی جماعت علماء حاکمِ وقت سے جنگ کرنے کو جائز نہیں سمجھتی تھی مگر ہوا

۱؎ ملاحظہ ہو احقر کی کتاب "سید احمد شہید کی صحیح تصویر"۔

یہ کہ میجر اسپینکی نے تھانہ بھون کے قاضی عبدالرحیم اور ان کے ساتھیوں کو بلا تحقیق بغاوت کے شبہ پر سہارنپور میں پھانسی دے دی تھی۔ لہٰذا یہ حضرات انگریزوں سے بدلہ لینے پر آمادہ ہو گئے۔ مجلس شوریٰ طلب کی گئی۔ اس میں مقتدر علماء نے جنگ کی مخالفت کی اور مولوی رشید احمد صاحب نے برملا کہا کہ یہ جذبۂ انتقام ہے اس کو کسی طرح جہاد سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔[1] مگر پھر بھی فتویٰ جہاد جاری کر دیا گیا اور حاجی امداد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو امیر مقرر کیا گیا۔ جب مقابلہ ہوا تو کچھ علماء شہید ہوئے باقی سب پسپا ہو کر روپوش ہو گئے۔ اور امیر جہاد حاجی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے خفیہ طور پر ۱۸۵۹ء میں مکہ مکرمہ کو ہجرت فرمائی۔ مختصر یہ کہ یہ جہاد بھی مشکوک ہے اسے انتقامی جنگ ہی کہا جا سکتا ہے۔

جناب سید احمد رائے بریلوی اور شاہ اسمٰعیل دہلوی کی صحبت و تعلیم کی وجہ سے حضرت فاطمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی دیوبندی شاخ کو ایک نعمتِ غیر مترقبہ حاصل ہوئی یعنی ان صاحبان کو بشارت و ہدایت دینے کے لیے عالمِ رویاء میں حضور سرورِ عالم صلواعلیہ وآلہ خود قدم رنجہ فرمانے لگے لیکن خوابوں کی حقیقت یہ ہے کہ بعض اوقات توہمات و تخیلات جو تحت شعور میں پوشیدہ ہوتے ہیں کسی مہیج کی وجہ سے خواب میں اُبھر آتے ہیں ان کو اصل نہیں سمجھنا چاہیئے۔ یہ صحیح ہے کہ حضرت سرورِ کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شبیہ مبارک خوابوں میں ابلیسِ لعین اختیار نہیں کر سکتا مگر اسے دھوکا دینے میں کمال ہے خواب میں اجنبی صورت کو کسی اور سے موسوم کر دینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے اب ان حضرات سے جنہیں خوابوں میں حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ کی زیارت نصیب ہوتی ہے۔ حلیہ مبارک دریافت کیا جائے تو ہر ایک مختلف شمائل بتائے گا۔ اس کی تاویل یہ کی جاتی ہے۔

۱؎ منقول از "مولانا محمد احسن نانوتوی" مصنفہ جناب محمد ایوب قادری صاحب ایم۔ اے کراچی

کہ ہر شخص کو اس کے ظرف کے مطابق دیدار ہوا کرتا ہے۔ اس کے کھلے معنی ہیں کہ اس قسم کے خوابوں میں اکثر توہمات و تخیلات کا دخل ہوتا ہے اور اصلیت نہیں ہوتی لیکن اگر سچ بھی ہوں تو تحدیث نعمت کے طور پر ان کا تذکرہ جائز ہو سکتا ہے مگر اس شرف کے جا و بیجا اظہار سے برکت جاتی رہتی ہے اور سعادت کا دروازہ بند ہو جاتا ہے اور یہ بھی یہ کہ غیرتِ حُسن اعلان کی روادار نہیں ہوتی پھر روحانیت و نُورانیت تو اس سے بھی زیادہ حساس ہوتی ہیں جن کو حضور رحمۃ للعالمین صلّی اللہ علیہ وسلم کی خوابوں میں زیارت ہوتی ہے وہ قیل و قال میں نہیں پڑا کرتے اور نُورانیت سے لطف اٹھایا کرتے ہیں۔ احادیث سے ثابت ہے کہ خوابوں کے احکام لائق تعلیم نہیں ہوتے[1] اس میں شک نہیں کہ رویائے صادقہ نبُوّت کا چالیسواں حصّہ ہیں لیکن رویائے صادقہ فضل رحمانی پر منحصر ہیں۔ اور ہر کس و ناکس کا مقسوم نہیں۔ رویائے صادقہ و کاذبہ میں امتیاز کرنے کے لیے بتایا گیا ہے کہ خواب دیکھ کر اس کی تین دفعہ نفی کی جائے۔ اگر ہر سہ مرتبہ تین راتوں وہی خواب تکرار کرے تو صادقہ ہے ورنہ کاذبہ ہے نفسانی نقوش اور اغوائے شیطانی کو رویائے صادقہ سمجھ لینا مخلصین کا شیوہ نہیں ہے۔

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ رب العالمین نے انہیں تین نعمتیں عطا فرمائیں ایک یہ کہ ان کے مرید نامی گرامی علماء ہوتے۔ دوسرے یہ کہ قیام کے لیے بیت اللہ میں جگہ ملی تیسری یہ کہ دہلی کے مدرسہ رحیمیہ کی طرح دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ڈالی[2] حضرت کا سال پیدائش ۱۲۳۳ھ ۱۸۱۲ء ہے اور انکا وصال مکہ معظمہ میں ۱۳۱۷ھ ۱۸۹۷ء میں ہوا

---

[1] فضائل صحابہ واہل بیت ص۲۲۲ ماخوذ از مکتوبات شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ۔

[2] یہ تحریک حاجی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سید عابد حسین نے ۱۲۹۷ھ ۱۸۶۷ء میں دارالعلوم کا دیوبند میں اجراء کیا۔ مہتمم مولانا قاسم اور نائب مہتمم مولوی رشید احمد بنائے گئے معاونین میں مولانا مہتاب علی اور حاجی صاحب کے بڑے بھائی ذوالفقار علی اور

(باقی نوٹ اگلے صفحہ پر)

اٹھارہ سال کی عمر میں شیخ نصیر الدین حنفی دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مرید ہوئے اور سلسلہ نقشبندیہ کی خلافت حاصل کی پھر حضرت نور محمد جھنجھانوی رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ سے سلسلہ صابریہ کی خلافت پائی اور اسی خاندان کے ہو رہے حج کے لیے ۱۸۴۱ء میں گئے اور ۱۸۴۳ء میں واپس آئے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں سے شکست کھائی اس کے بعد ۱۸۵۹ء میں مولوی محمد یعقوب اور عبدالغنی کی معیت میں براہ سندھ خفیہ طور پر ہجرت فرمائی حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ مرنجاں مرنج اور منکسر المزاج تھے ہر شخص کی خاطر و طبیعت کا لحاظ و پاس رکھتے تھے۔ اگر کوئی ان کی رائے نہیں مانتا تو فرما دیتے کہ تمہاری خوشی مختلف قسم کے عقائد رکھنے والے ان کے مرید تھے ایک غیر مقلد نے مرید ہونے کے بعد آمین بالجہر اور رفع یدین کو ترک کر دیا۔ حاجی صاحب نے اس سے اس کی وجہ دریافت کی اور فرمایا کہ اگر ہماری وجہ سے ترک کیا ہے تو نہ کرو میں ترک سُنّت کا باعث کیوں بنوں سُنّت یہ بھی ہے اور وہ بھی اور اگر اپنی مرضی سے ترک کیا ہے تو خیر تم جانو۔ غرض حاجی صاحب کی وسعت قلبی اور رواداری بے مثل خصوصیت تھی۔ ان کی تواضع کا مزید ثبوت یہ ہے کہ جب ان کے خلفا کسی پر کفر کا فتویٰ لگاتے تو حضرت تاویل فرمایا کرتے تھے[1] ایک مرتبہ کسی نے حاجی صاحب کی تکفیر کی تو فرمایا کہ میں عنداللہ اگر مومن ہوں تو مجھ کو کسی کی تکفیر مُضر نہیں۔ اور اگر خدانخواستہ کافر ہوں تو بُرا ماننے کی کیا بات ہے۔

حاجی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنا حصہ جائداد اپنے منجھلے بھائی فدا حسین

بقیہ نوٹ پچھلا صفحہ

دیگر حضرات جو شاہ عبدالقدیر رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں کے تعلیم یافتہ تھے، قابلِ ذکر ہیں مسجد چھتہ میں مدرسہ جاری کیا گیا۔ جامع مسجد کی بنیاد ۱۲۸۲ھ میں رکھی بعد کو کمیٹی میں اختلافات شروع ہوئے تو سید عابد علی صاحب حج کو تشریف لے گئے انکی عدم موجودگی میں تنازعات فسادات اور بڑھے۔ حج سے واپس آکر سید صاحب کمیٹی سے مستعفی ہو گئے۔ سید صاحب کی پیدائش ۱۲۵۰ھ میں اور وفات ۱۳۳۱ھ میں ہوئی۔

[1] امداد المشتاق ص۳۷۸

کو ہبہ کر دیا تھا۔ جب مرید ہونے کے لیے کثرت سے علماء آنے لگے تو ان کے قیام و طعام میں دقت واقع ہوئی۔ لہٰذا فدا حسین کی اہلیہ نے مہمان نوازی کی ذمہ داری لی۔ کچھ دن کے بعد حاجی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے خواب میں دیکھا کہ ان کی بھاوج کھانا پکا رہی ہیں اتنے میں حضور سرور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مع صحابہ کے تشریف لائے اور فدا حسین کی بیوی سے فرمایا کہ تو اس قابل نہیں کہ امداد اللہ کے مہمانوں کے لیے کھانا پکائے ان کے مہمان علماء ہیں۔ ان کیلئے کھانا ہم خود پکائیں گے[1] تعبیر یہ لی گئی کہ علماء کثرت سے مرید ہوں گے۔

اس خواب کی تعبیر کے بعد جو عالم و فاضل مُرید ہوتے اُن میں سب سے اول مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی تھے[1]۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ مولوی صاحب پہلی مرتبہ کسی مولوی سے مناظرہ میں کامیابی کی دعا کے لیے حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ حاجی صاحب نے انہیں سمجھایا کہ مناظرہ کرنا اچھا نہیں ہوتا اس سے دل سیاہ ہوتا ہے[2]۔ اس پہلی حاضری کے بعد مولوی صاحب نے بارہا مرید کیے جانے کی درخواست کی مگر مسموع نہیں ہوئی لیکن جب حافظ ضامن علی صاحب نے سفارش کی تو انہیں مرید کر لیا۔ اس تعویق کی وجہ یہ بتائی گئی کہ شوق و طلب کو بڑھانا اور پختہ کرنا منظور تھا۔ وقت بیعت مولوی صاحب نے یہ شرط پیش کی تھی کہ "ذکر و شغل اور محنت و مجاہدہ مجھ سے کچھ نہ ہو سکے گا۔" حاجی صاحب نے ہنس کر فرمایا کیا مضائقہ ہے[3]۔ عرصہ کے بعد مولوی اشرف علی نے دریافت کیا کہ شرط قبول کرنے کے بعد تعلیم کی کیا صورت رہی جواب دیا کہ "بس مرمٹا۔ میری چارپائی اپنے برابر بچھوائی گئی۔ رات

[1] ارواح ثلثہ و امداد المشتاق صد ۲۳ و صد ۲۴ [2] امداد المشتاق صد ۱۸ و صد ۳۷۶ و فیض الاکابر صد ۹۹ تا صد ۱۰۱ [3] امداد المشتاق صد ۱۹/۲۲ و تذکرۃ الرشید صد ۵۷
امداد المشتاق صد ۲۰

کو وہ اپنے ورد و وظائف میں ہوتے تھے اور میں سونا چاہتا تھا مگر نیند نہیں آتی تھی۔ لہٰذا رفتہ رفتہ میں بھی ذکر و فکر کرنے لگا۔ ایک رات کو میں نے از خود ذکر بالجہر کیا تو صبح کو فرمایا تم نے تو ایسا ذکر کیا جیسے کوئی بڑا مشاق کیا کرتا ہے۔ غرض اس طرح ہمت افزائیاں کر کے مجھ سے مجاہدات کروا لیے اور میری شرط کو کالعدم کر دیا[1]۔

امداد المشتاق مصنفہ مولوی اشرف علی تھانوی صاحب کے صفحہ ۲۶ کے فٹ نوٹ میں لکھا ہے کہ بعض مسائل میں علماء میں اختلاف تھا مگر اس اختلاف سے اصل مقصود میں قدح لازم نہیں آتا۔ پھر یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ "ہمارے حاجی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ علماء تنازع کر کے العلم حجاب الاکبر کے مصداق بن جاتے ہیں۔" اشرف علی صاحب کی اس تحریر کے معنی جو کچھ بھی ہوں مگر حقیقت یہ ہے کہ اختلاف بعض خلفاء اور حاجی صاحب کے درمیان میں تھا۔ چنانچہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کا ارشاد ہے کہ میرے خلفاء دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جنہیں میں نے از خود خلافت دی ہے۔ دوسرے وہ جن کو تبلیغ دین کے لیے ان کی درخواست پر اجازت دیدی ہے[2]۔ جن خلفاء کو از خود خلافت دی انہوں نے پوری طرح حاجی صاحب رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کا اتباع کیا، مثلاً مولوی لطف اللہ علی گڈھی۔ مولوی احمد حسن کانپوری مولوی محمد حسین الہ آبادی اور مولوی عبد السمیع رام پوری جن خلفاء نے حاجی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے اختلاف کیا ان میں مولوی محمد قاسم نانوتوی۔ مولوی رشید احمد گنگوہی اور مولانا اشرف علی تھانوی کے اسماء گرامی سر فہرست ہیں۔

یہ اختلاف اپنی نوعیت کے لحاظ سے عجیب و غریب اور رکیک و مبتذل

[1] امداد المشتاق صد ۲۰
[2] " " " "

ہے۔متعدد مرتبہ علما۔ دیوبند کی شکائتیں حاجی صاحب سے کی گئیں مگر انہوں نے فرمایا کہ مولوی رشید احمد صاحب کی تحقیقات للّٰہیت پر مبنی ہے اور اس میں نفسانیت کا شائبہ نہیں اس بحث و تکرار میں عمر تلف نہیں کرنا چاہیئے۔ اس سے محبوب حقیقی سے حجاب ہو جاتا ہے [1] پھر یہ فرمایا کہ جو ہمارا معتقد ہے وہ ہم سے منحرف نہیں ہو سکتا۔[2] بعد میں رفع فساد کے لیے حاجی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے دو رسالے "وحدت الوجود" اور "فیصلہ ہفت مسئلہ" لکھ کر بھیج دیئے[3] جن میں اپنے مشرب طریقت و شریعت کی وضاحت کی۔ رسالہ فیصلہ ہفت مسئلہ بھیجنے کے بعد مولانا محمد حسین الٰہ آبادی سے بذریعہ خط دریافت کیا وہ تحقیق کر کے بتائیں کہ ہمارے لوگوں نے "دیوبند وغیرہ" اس رسالے کو کس نظر سے دیکھا اور اس کو پسند کیا یا نہیں[4] علمائے دیوبند نے اپنی تحقیقات کی بنا پر ان رسالوں کو نگاہ غلط انداز سے بھی نہیں دیکھا بلکہ فیصلہ ہفت مسئلہ کو نذرِ آتش کروا دیا۔ ان اختلافات کی حاجی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی نذر میں رتی برابر بھی اہمیت نہیں تھی کیونکہ وہ سب ہی فروعی تھے۔ سمجھانا ان کا کام تھا۔ ماننا یا نہ ماننا ان لوگوں کا کام تھا۔ مبلغ مرشد اور رسول کا فرض حق کو پہنچا دینا ہوتا ہے اور بس وہ مجبور نہیں کر سکتے۔ ہدایت اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ ایسا یکطرفہ اختلاف یا تخیل گویا اپنی ڈفلی پر اپنے راگ کی مثال تھا چنانچہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی پیشانی پر بل تک نہیں آیا۔ البتہ یہ نصیحت فرمائی کہ اختلاف منظرِ عام پر نہ لایا جائے تاکہ فتنہ و فساد نہ پھیلے مگر علمائے دیوبند ماننے والے کب تھے۔ بایں ہمہ حاجی صاحب

---

[1] امداد المشتاق ص ۱۷۱ و قصص الاکابر ص ۳۷ و فیصلہ حقیقت مسئلہ

[2] رسالہ وحدت الوجود ص ۲ و شمائم امدادیہ ص ۵۷ رسالہ ۱۲۹۹ھ / ۱۸۸۱ء میں تصنیف فرمایا تھا

[3] فیصلہ ہفت مسئلہ رجب ۱۳۱۲ھ / ۱۸۹۴ء میں بھیجا تھا۔

[4] سوانح حیات شاہ محمد حسین الٰہ آبادی ص ۳۰۳

رحمۃ اللہ علیہ نے ہر ہر موقع پر ان صاحبان کی قدر و منزلت کا برابر اظہار کیا ہے۔ مولوی رشید احمد صاحب کے اس شبہہ کے متعلق کہ شاید حاجی صاحب کبیدہ خاطر ہو گئے اپنے خط میں اس کی تردید کرتے ہوئے آخر میں لکھا کہ "فقیر نے مسائل مختلف فیہا کے باب میں آپ کی کوئی تحریر نہیں دیکھی نہ پڑھی اور نہ اس کی تفتیش کی۔ فقیر تو آپ کے سب اقوال کو موافق شرع ہی جانتا ہے۔ مزید برآں اگر بعض مسائل میں موافقت نہ ہو تو فقیر ایسے اختلاف کو صحابہ کا اختلاف سمجھتا ہے اور آپ کے ہر قول کی تاویل و توجیہ میرے دل میں نہایت جمعیت بخش و تسلی دہ ہے[1] حاجی صاحب نے اپنی تواضع اور اپنے اخلاق کریمانہ سے ان کی جو تعریف اور عزت افزائی کی اس میں اصلاح کی کوشش موجود ہے جسے تالیف قلوب بھی کہا جا سکتا ہے بقول شخصے "عاقلاں را اشارہ کافی است" افسوس یہ حضرات اپنی مشیخت میں پھولے نہیں سماتے اپنی رائے پر اڑے رہے پایان کار اپنی تحقیقات کے لتنے ڈھول بجائے کہ اس کی آواز ابھی تک گونج رہی ہے۔ مولوی رشید احمد صاحب نے اعلان کیا کہ "جس فن کے امام حاجی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ہیں ہم ان کے مقلد ہیں۔ باقی ان فرعیات کے امام ہم ہیں حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو چاہیئے کہ ہم سے پوچھ پوچھ کر عمل کریں" اور مولوی قاسم نے فرمایا کہ "ہماری معلومات زائد ہیں اور حاجی صاحب کا علم زائد ہے"[2] ان ارشادات کے معنی جو کچھ بھی سمجھے جائیں۔ مگر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ان کے نزدیک طریقت، شریعت سے جدا فن ہے۔ مگر حاجی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا کہنا ہے کہ اقرار باللسان اشارہ طرف شریعت کے ہے اور تصدیق بالجنان

---

[1] امداد المشتاق ص ۱۹۶ (تاویل کا لفظ غور طلب ہے۔ تاویل اسی بات کی جاتی ہے جو مشکوک اور صحیح نہ ہو۔)

[2] امداد المشتاق ص ۱۹۶

سے مطلب طریقت ہے۔ اقرار بدون تصدیق کے نفاق ہے اور تصدیق بلا اقرار کے بیکار ہے۔[1] ان صاحبان نے اس اختلاف کی حضرت امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ اور ان کے شاگردوں اور حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اختلاف سے مثال دی اور مولوی اشرف علی صاحب نے تو اس اختلاف کو جائز قرار دینے کے لیے اپنی ساری قابلیت صرف کر دی مگر ساتھ ہی از راہ انصاف یہ بھی تحریر کیا ہے کہ بقول شخصے "تا نباشد چیزکے مردم نگویند چیزہا"

اعلیٰ حضرت کو وہ تشدد پسند نہ تھا جس کو امام ربانی نے اصلاح خلق و احیاء سنت کے لیے دانتوں سے مضبوط پکڑ رکھا تھا...... مسئلہ مسلمہ کی بنا پر اعلیٰ حضرت کی طرف سے اہلیت و استعداد نام کا پروانہ ملے پیچھے صاحب نسبت مجاز طریقت بن کر اعلیٰ حضرت کے اس خیال سے امام ربانی کا موافقت نہ فرمانا شریعت میں تو کیا طریقت میں بھی کسی الزام کا باعث نہیں ہو سکتا...... جو کچھ بھی ہو بدنفس معاندین کے لیے اس مبحث میں پڑنا سبب ضلال ہو گیا اور جس نے جو چاہا کہا مگر خدا شاہد ہے۔ بات یہ تھی کہ لاریب حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کو قدوۃ العلماء اور جامع شریعت والطریقت نائب رسول بن کر اس طریق کا اختیار فرمانا جو بظاہر شیخ کے قول و عمل سے ظاہر ہو رہا تھا۔ زبردست لغزش تھی جو آپ کو اس مرتبہ عالیہ تک پہنچنے کے لیے وہ مضبوط دیوار بن کر روکنے والی تھی۔

بے ادب را اندریں رہ بار نیست — جائے اُو بر دار شد و دار نیست
از خدا خواہیم توفیق ادب — بے ادب محروم گشت از فضل رب

آپ کی استقامت کا دُر فرید بال سے زیادہ باریک راستہ میں آفتاب نصف

[1] قصص الاکابر نمبر ۲۲ و ۲۰، وضیاء القلوب صـ ۹۷

النہار کی طرح ایسا چمکا کہ عالم نے دیکھ لیا....۔"

یہ استدلال ذوالوجہین ہے[1] تشدد و بے ادبی کا اقرار بھی ہے اور انکار بھی۔ ان تشبیہوں میں بھی مغالطہ ہے۔ امام صاحب اور ان کے شاگردوں کا اختلاف فقہی امور میں تھا اور ان کا اختلاف عقائد کے متعلق ہے۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا مختلف الرائے ہونا ایک حقیقت یا منظر کو دو مختلف سمتوں سے معائنہ کرنے کی وجہ سے تھا۔ دونوں کے مشاہدات پر شبہ کیا جا سکتا ہے۔ مگر دونوں صحیح ہیں اسی وجہ سے ان کے اختلاف کو رحمت سے تعبیر کیا گیا۔ یہ اختلاف مناظر حقیقت کی لامحدود وسعت اور بے مثل خوبی کا اظہار ہے۔ یہ کہ کس صحابی کے مشاہدہ کو زیادہ پسند کیا جاتا ہے یہ اپنے اپنے نقطۂ نظر پر منحصر ہے۔ مگر یہاں معاملہ دگرگوں ہے حاجی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنے خلفاء کے نقطۂ نظر کی ہمیشہ تاویل کی۔ ظن نیک سے کام لیا ان کو غلط نہیں کیا۔ مگر ان کے خلفاء نے حاجی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نظریہ پر برابر اعتراض کیے۔ اس اختلاف کے جواز میں مولوی اشرف علی صاحب نے کافی ثبوت فراہم کیے ہیں مگر ان میں تضاد ہے ان کے تمام دلائل منطقی ہیں۔ ان میں صلاحیت قلب و روح کا شائبہ بھی نہیں۔ درحقیقت حاجی صاحب نے واضح طور پر بتایا کہ "فقیر وہ ہے جو حنفی المذہب و صوفی المشرب ہو۔ جو کوئی اس سے تجاوز کرے گا میرے رابطہ و واسطہ سے اسے کچھ حصہ نہ ملے گا۔ اور جو فقیر سے اخلاص رکھتا ہو اس پر لازم ہے کہ صوفی المشرب و حنفی المذہب ہو۔ غیر مقلد حدیث دانی اور اہل حدیث ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ حاشا وکلا حقانیت سے بہرہ نہیں رکھتے۔ لہٰذا وہ اہل حدیث کے زمرہ میں شامل نہیں ہو سکتے۔ بلکہ ایسے لوگ دین کے رہزن ہیں ان کے اختلاط سے احتیاط چاہیے۔"[2]

[1] امداد المشتاق صـ ۱۹۳ و ۱۹۴ ۔ [2] ملفوظات مرتبہ محمد احسن صاحب صـ ۵۰ ۔

اس بحث و استدلال پہ توجہ کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ نزاعی مسائل کو سمجھ لیا جائے تاکہ ان کے دلائل کی حقیقت واضح ہو سکے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو۔ حاجی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی کتاب "ضیاء القلوب" میں ذکر و فکر اور اشغال مجاہدات کے طریقے لکھے ہیں تاکہ روحانیت کے مدارج آسانی سے طے کئے جاسکیں۔ مگر یہ حضرات ضیاء القلوب کو ماؤل سمجھتے ہیں۔ طریقت کا ہر سلسلہ مجاہدات کو لازمی و ضروری قرار دیتا ہے۔ مجاہدات کو ولایت عامہ سے موسوم کیا ہے۔ اب اگر ان صاحبان کو مجاہدات کے متعلق چون و چرا ہے تو اس کی وجہ وہی شرط ہو سکتی ہے جو پہلے ہی دن بیعت کے وقت مولوی رشید احمد صاحب نے پیش کی تھی۔ کہ مجھ سے محنت و مجاہدات وغیرہ کچھ نہ ہو سکیں گے یہ صاحبان تصوّرِ شیخ کو ناجائز اور بُت پرستی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی نے خود اقرار کیا ہے کہ تین سال تک حاجی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا چہرہ پیشِ نظر رہا اور میں نے بغیر اس سے پوچھے ہوئے کوئی کام نہیں کیا۔[1] مولوی اشرف علی صاحب نے قطعی طور پہ اعلان کر دیا کہ چشتیوں میں تصوّرِ شیخ جائز نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی ذات کو کل چشتیوں سے موسوم کر دیا۔ انہیں یہ لکھنا چاہیئے تھا کہ تصوّرِ شیخ کو میں جائز نہیں سمجھتا اگرچہ چشتی جائز سمجھتے ہیں۔ مسئلہ وحدت الوجود کے یہ بالکل مخالف ہیں اور اس کو کفر و شرک خیال کرتے ہیں۔ چونکہ یہ دیوبندی علماء طریقت کو علم معقول سے سمجھنے کے عادی ہیں اس لیے ایسا اختلاف وجود میں آنا ضروری تھا اور اس پہ انہیں ناز ہے شریعت کے جن مسائل میں ان کو اختلاف ہے وہ سات ہیں۔ ان میں سے پانچ عملی اور بقیہ دو علمی ہیں۔ وہ پانچ مسائل یہ ہیں۔ (۱) مولود شریف[2] (۲) عرس (۳) سماع (۴) ندائے غیر اللہ

---

[2] امداد المشتاق صفحہ ۲۹ سے حاجی صاحب مکہ معظمہ میں نہ صرف مولود شریف کرتے تھے بلکہ رجبی شریف کی محافل بھی منعقد کرتے تھے ان ہی کی تقلید میں یہاں آکر شاہ محمد حسین الہ آبادی نے رجبی شریف کی مجلس کو رائج کیا تھا۔

(ماخوذ از سوانح حیات شاہ محمد حسین الہ آبادی)

(۵) جماعت ثانیہ۔ ان امور کے متعلق جو رلتے انہوں نے قائم کی اس سے کوئی فائدہ مترتب نہیں ہوتا، بہرحال اپنی اپنی نظر اور اپنی اپنی رائے ہے لیکن یہ کیسے غضب کی بات ہے کہ ان فرعیات کو اصل اصول سے کہیں زیادہ اہمیت دی گئی اور اس طرح اس فخر و ناز سے ملّت اسلامیہ میں تازہ فتنہ و فرقہ بندی کی بنیاد پڑ گئی۔ اب رہے دو علمی مسائل (۱) امکان نظیر (۲) امکان کذب تو یہ محض قیاسی وہمی و لاطائل مسائل ہیں جن کا حاصل حصول کچھ نہیں اور جن کو اغوائے شیطانی کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بحث کی گئی ہے کہ اللہ جل شانہٗ حضرت خاتم النبیّین صلی اللہ علیہ وسلم کا نظیر پیدا کر سکتا ہے یا نہیں۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ سے جھوٹ سرزد ہو سکتا ہے یا نہیں۔ العظمۃ للہ اب اگر ان حضرات سے ایسے ہی لاطائل سوال کئے جائیں تو کیا جواب دیں گے آیا ایک مقدس و معتبر مولوی گناہ پہ قدرت رکھتا ہے یا نہیں اور یہ کہ اللہ تعالیٰ جو حی و قیوم ہے اپنے مارنے اور خود کو فنا کرنے پہ قادر ہے یا نہیں۔ بہرحال یہ بحثیں الٰہیات و مابعد الطبیعیات اور فقہی جزیات کی ہیں ان بحثوں کا طریقت سے تو دور کا بھی واسطہ نہیں اور شریعت بھی ان کی روادار نہیں ہو سکتی۔ جب ان مسائل کی یہی حقیقت ہے اور ان کی شریعت و طریقت میں کوئی اہمیت نہیں تو ملاحظہ طلب یہ ہے کہ ان حضرات نے مرشد سے اختلاف کر کے دین و دنیا میں کون سے چاند لگائے۔ یہ اختلاف غالباً ضد، خود نمائی اور خود ستائی پہ مبنی ہے اور اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ وہ چاہتے تھے کہ جس طرح طریقت کا امام حاجی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو ہم تسلیم کرتے ہیں اسی طرح حاجی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرعیات کا امام ہمیں مان لیں اور ہماری پیروی کریں۔ اس قسم کی ضد خود نمائی اور پندار اہل طریقت قدمِ اول پہ فنا کر دیتے ہیں۔ نفیِ نفس طریقت میں ضروری سمجھی گئی ہے تاکہ اس قسم کے شیطانی وہم و وسوسے پیدا نہ ہونے پائیں۔ یہ خلفاء جن فروعی عقائد پہ نازاں ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عملاً

شاہ اسمٰعیل دہلوی کے مُتبعِ ومقلّد تھے۔ ان میں نہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے عقائد پائے جاتے ہیں۔ نہ ان میں حاجی صاحب کی تعلیم وتربیت واشغال کی روح ملتی ہے اور نہ جذب وسلوک کے مراتب دکھائی دیتے ہیں۔ یہ حضرات جب شاہ عبدالرحیم فاطمی ولایتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو حضرت سید احمد صاحب کا خالص خلیفہ ثابت کرتے ہیں تو کیا وجہ کہ اپنے آپ کو نقشبندی نہیں کہتے اور صابری کیوں بنتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

یہ مرثیہ یہیں ختم نہیں ہوتا آجکل ہر جگہ فیروزی واکبری عہد سے زیادہ مذہبی بے حسی کا دور دورہ ہے۔ منم کی نمائش ہے۔ ذاتیات کا مظاہرہ کیا جاتا ہے اور حقیقت وخودی مصلوب ہو چکی ہیں۔ اصلاح وتدبیر کی طرف توجہ کم ہے ہر شخص اپنے آپ کو دوسروں سے اعلیٰ وبالا سمجھتا ہے یگانگت واتحاد عنقا ہیں۔ عموماً تمامی مساعی جمیلہ جلسہ وجلوس۔ احتجاج وفریاد اور چندے جمع کرنے پر ختم ہو جاتی ہے صابری تعلیم نے ظاہری لباس پہن کر فروغ حاصل کیا تھا لیکن موجودہ نئے فیشن کی پوشاک اسے راس نہیں آئی۔ سماع جو چند شرائط کے ساتھ خلوت میں ہوتا تھا۔ اب آزادی اختیار کر کے مجلسی بن گیا ہے۔ اکبر کے زمانہ میں وحدت الوجود کی جو گت بنی تھی وہی آجکل سماع کا حال ہے۔ یہاں تقریباً پچیس تیس صابری خانقاہیں ہیں وہ لکیر کو پیٹ رہی ہیں اب ان کا مصرف وہ نہیں رہا جو کبھی تھا۔ حالانکہ دعویٰ وہی ہے۔ اس گری ہوئی حالت میں اگر اصل مقصد کے لیے متحدہ کوشش کی جائے تو عرسوں میں کوئی وجہ نہیں کہ اتحاد وتاثیر نہ ہو بہر حال رحمت حق بہانہ می جوید

خُلاصَہ

(۱) سلسلہ صابری اپنے دوسرے خلیفہ حضرت کبیرالاولیا تک نقاب پوش رہا۔

(۲) جب سہروردیوں اور نظامیوں میں اختلاف ہوا تو تیسرے خلیفہ شیخ العالم حضرت احمد عبدالحق ردولوی رحمۃ اللہ علیہ نے نقاب الٹ دی اور صابری تعلیم کی علانیہ تبلیغ کی اور یہی حضرت صابری سلسلہ کے مجدد ہیں۔

(۳) شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے جدید طرز تعلیم کی بہترین طریقہ سے اشاعت کی اور معقولات کی وجہ سے تصوف کی جو مخالفت کی جاتی تھی اس کا دفعیہ بڑے کمال سے کیا۔

(۴) شیخ گنگوہی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے اس مقولہ کے کہ "من ایں سلسلہ را رنگ دیگر دادہ ام" کے یہ معنی نہیں کہ جلال وجمال میں اعتدال پیدا کیا بلکہ یہ معنی ہیں کہ امراء سے ربط وضبط میں مبالغہ کیا اور تعلیم وحدت الوجود کو عام کیا۔ مگر ان کے خلفاء نے امراء سے تعلقات نہیں بڑھائے اور چشتیوں کی قدیمی روش اختیار کی۔

(۵) شیخ گنگوہی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے بعد مرکزیت جاتی رہی تھی۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مرکزیت کو جاری کرنا چاہا مگر ان کے خلفاء نے اس کو پھر ختم کر دیا۔

(۶) حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے بعض خلفاء نے بعض مسائل میں اختلاف کیا پھر اس کے متعلق انہوں نے جب حاجی صاحب سے استفسار کیا تو حاجی صاحب نے جواب میں لکھا کہ آپ کے اختلافات کی مجھے خبر نہیں۔ نہ آپ کی تحریریں میری نظر سے



حضرت جمال الدین ہانسوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

۱۔ حضرت مخدوم علاء الدین علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ

حضرت سلطان المشائخ سید نظام الدین بدایونی ثم دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

۲۔ حضرت شمس الدین پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ

۳۔ حضرت جلال الدین کبیر الاولیاء پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ

خواجہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ

۴۔ حضرت شیخ العالم احمد عبدالحق ردولوی رحمۃ اللہ علیہ

شیخ نظام ساتی رحمۃ اللہ علیہ

شیخ ببر ردولوی رحمۃ اللہ علیہ

شیخ بختیار رحمۃ اللہ علیہ

شیخ جان جونپوری رحمۃ اللہ علیہ

۵۔ حضرت شیخ محمد عارف ردولوی رحمۃ اللہ علیہ

عبدالغفور اعظم گڈھی رحمۃ اللہ علیہ ؎۱

۶ حضرت شیخ محمد ردولوی رحمۃ اللہ علیہ

(؎۱ ان بزرگوں سے اگر سلسلہ چلا ہے توان کے خلفائے کے نام اور پتے مطلوب ہیں۔)

گذریں اور نہ میں نے ان کے متعلق تفتیش کی۔

(۷) جب فیصلہ ہفت مسئلہ لکھ کر بھیجا تو حاجی صاحب نے اپنے خلیفہ حضرت محمد حسین الہ آبادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے دریافت کیا تھا کہ خلفاء نے دیوبند نے اس کو کس نظر سے دیکھا۔ آیا پسند کیا یا نہیں۔

(۸) جملہ سلاسل سے پیشتر بیرون ہند سلسلہ کی اشاعت حضرت نظام الدین بلخی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور شاہ محمد نبی امروہوی نے کی اور سلسلہ صابری کو مقبول بنایا۔

(۹) اپنے قیام الہ آباد میں شہزادہ دارا شکوہ حضرت محب اللہ الہ آبادی سے مستفیض ہوا تھا اور اس کا ذکر اس نے سفینۃ الاولیاء میں کیا ہے۔

(۱۰) شاہ عضد الدین امروہوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے شاہی عطیات قبول نہیں کئے اور لودیوں کی معزولی کی پیش گوئی کی۔

(۱۱) عبدالرحیم فاطمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ شاہ عبدالباری امروہوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے خلیفہ تھے لہذا اختلاف کرنے والے خلفائے حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا دعویٰ کہ حضرت فاطمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ حضرت سید احمد رائے بریلوی کے خلیفہ تھے۔ صریحاً غلط ہے۔

(۱۲) حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے اختلاف کرنے والے خلفا کا طرز عمل اسمٰعیلیہ و نجدیہ سے ملتا جلتا ہے۔ صابری تعلیم و تربیت کی روح ان میں نہیں پائی جاتی۔

۷- حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ | شیخ مدھار رحمۃ اللہ علیہ [1]

شیخ رکن الدین

شیخ عبدالاحد (والد جناب مجدد سرہندی) رحمۃ اللہ علیہ | ۸- حضرت جلال الدین تھانیسری رحمۃ اللہ علیہ

۹- حضرت خواجہ نظام الدین بلخی رحمۃ اللہ علیہ

۱۰- حضرت شیخ ابو سعید گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ

شیخ محمد صادق گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ | ابراہیم رامپوری رحمۃ اللہ علیہ | ۱۱- حضرت محب اللہ الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ | ابراہیم پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ | شاہ درگاہی رامپوری رحمۃ اللہ علیہ

شیخ محمد رحمۃ اللہ علیہ، شیخ داؤد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ | سید محمد دہلوی رحمۃ اللہ علیہ | ۱۲- شاہ محمدی امروہوی رحمۃ اللہ علیہ

غریب اللہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ، | عبد الجلیل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ الہ آبادی | شاہ ابو المعالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ | سید نصیر الدین رحمۃ اللہ علیہ | ۱۳- شاہ محمد مکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

شیخ محمد اعظم رنبوی رحمۃ اللہ علیہ | میران بھیک رحمۃ اللہ علیہ | سید غلام سادات علی رحمۃ اللہ علیہ | ۱۴- شاہ عضد الدین امروہوی رحمۃ اللہ علیہ

شاہ محمد جمال رنبوی رحمۃ اللہ علیہ | شاہ عنایت علی رحمۃ اللہ علیہ | ۱۵- شاہ عبد الہادی امروہوی

غلام علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ | شیخ عبد الکریم ملا فقیر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ

([1] اپنے بزرگوں سے اگر سلسلہ چلا ہے تو ان کے نام و پتے مطلوب ہیں)

غلام علی شاہ | ۵ شیخ عبد الکریم رحمۃ اللہ علیہ | سید غلام سادات علی رحمۃ اللہ علیہ | ۱۵- شاہ عبد الہادی امروہوی رحمۃ اللہ علیہ

غلام احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ | حافظ عبد الرحمن رحمۃ اللہ علیہ | سید صابر علی رحمۃ اللہ علیہ | شاہ نوازش علی رحمۃ اللہ علیہ | ۱۶- شاہ عبد الباری امروہوی رحمۃ اللہ علیہ

امین الدین رحمۃ اللہ علیہ شاہ آبادی | شیخ امام علی رامپوری رحمۃ اللہ علیہ | ۱۷- شاہ عبد الرحیم فاطمی ولایتی رحمۃ اللہ علیہ

شاہ غلام حسین رحمۃ اللہ علیہ | ۱۸- میانجی نور محمد جھنجھانوی رحمۃ اللہ علیہ

محمد حسین انصاری رحمۃ اللہ علیہ | محمود شاہ رحمۃ اللہ علیہ | محمد فقیر شاہ رحمۃ اللہ علیہ | ۱۹- حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ | ضامن علی شہید رحمۃ اللہ علیہ | شیخ محمد رحمۃ اللہ علیہ

میانجی کریم بخش رامپوری | شاہ علی حسین رحمۃ اللہ علیہ

سید محمد عابد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ | صوفی محمد حسین مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ

ہمچنیں مسلسل | ہمچنیں مسلسل | ہمچنیں مسلسل

مولوی رشید احمد گنگوہی | مولوی قاسم نانوتوی | محمد یعقوب | اشرف علی تھانوی | شاہ محمد حسین الہ آبادی | شاہ احمد حسین کانپوری

ہمچنیں مسلسل [1] | مولوی عبد السمیع رامپوری | مولوی لطف اللہ علی گڑھی

ہمچنیں [1]

[1] حاجی صاحب کی یہ دیوبندی شاخ حضرت سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل دہلوی سے مستفیض و متاثر ہونیکے علاوہ شاہ عبد الرحیم فاطمی کو سید احمد رائے بریلوی کا خالص خلیفہ مانتی ہے۔

درگاہ و عُرس

رُڑکی کے ریلوے اسٹیشن سے صابری درگاہ تک تقریباً پانچ میل کا فاصلہ ہے سڑک نہر کے برابر چلتی ہے۔ راستہ خوش گوار اور منظر دلفریب ہے۔ آدھے راستے پر سولانی ندی ہے۔ ندی کا پُل پچاس فٹ بلند ہے ندی کا نیچے بہنا اور پُل کے اوپر نہر کا چلنا انجنیئری کا کمال ہے۔ نہر کے برابر سڑک اپنی بہار دکھاتی ہے۔ پُل زیادہ چوڑا نہیں ہے اس لیے راستہ یک سمتی ہے۔ نہر کے سرے کے ادھر ادھر دونوں جانب شیروں کے مُہیب بُت نصب ہیں۔ آگے بڑھ کر چار فرلانگ سے بائیں ہاتھ کی طرف روضہ شریف کا گُنبد اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ یہ روضہ ۱۰۳۳ھ میں تعمیر ہوا تھا۔

نہر اور سڑک کے بائیں جانب درگاہ کے احاطہ تک خالی میدان ہے۔ یہاں ٹانگے اور لاریاں وغیرہ کھڑی ہوتی ہیں۔ اسی طرف درگاہ کے متصل بریلی و رامپور کے زائرین کی پختہ قیام گاہیں ہیں۔ نہر ۱۸۴۹ء میں جاری ہوئی تھی ۱۸۸۵ء میں اودھ روہیلکھنڈ ریلوے نکلی تھی۔ جس کی وجہ سے آمد و رفت میں آسانی ہوئی۔ اور عرس کی رونق میں اضافہ ہوا۔ درگاہ کے قریب نہر کا ایک پُل ہے۔ اس پُل سے ایک سڑک مشرق میں امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے روضہ کی طرف جاتی ہے اور اسی جانب کلیر کی آبادی ہے۔ یہی سڑک پل سے دوسری طرف مغرب میں حضرت مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی درگاہ تک پہنچتی ہے۔ اس درگاہ والی

سڑک کی دو شاخیں ہیں۔ ایک شاخ سیدھی مغرب کو چلی جاتی ہے اور دوسری شاخ جنوبی سمت میں درگاہ کے مشرقی دروازہ تک پہنچاتی ہے۔ اس جنوبی سڑک کے مشرق میں صابری اسٹور اور صابری ہوٹل ہے اور اس کے بعد نقار خانہ ہے۔ اس سڑک کے مغربی سمت میں باورچی خانہ کی بیرونی دیوار ہے اور ایک چبوترہ ہے۔ چبوترہ پر مست ملنگ اپنا بستر جمانے ہیں اور چرس وغیرہ میں چُور رہوتے ہیں۔ اس کے بعد اگربتی۔ پھول اور مٹھائی کی دکانیں ہیں۔

مشرقی دروازہ عالی شان ہے۔ اس کے دونوں طرف حجرے ہیں۔ داخل ہوتے ہی سامنے روضہ پہ نظر پڑتی ہے۔ روضہ کے اندر حضرت کا مزار مبارک ہے یہ روضہ گلزاری کے جھونپڑے کی جگہ پہ ہے جہاں کلیر تشریف لا کہ مخدوم پاک گولڑ کے درخت کے نیچے قیام پذیر ہوئے تھے روضہ سے پہلے سنگ مرمر کا مختصر سا حوض اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ یہ اس گولڑ کے درخت کی جگہ ہے جس کی شاخ پکڑ کہ حضرت استغراق میں کھڑے رہتے تھے۔ اصل درخت اب نہیں رہا۔ مگر اس کے دو تین بچے باقی ہیں جن سے اس گولڑ کا نام چل رہا ہے۔ اسی احاطہ میں شمال کی جانب ایک سایہ دار گولڑ کا درخت ہے۔ لوگ تبرک کے طور پہ اس کے پھل پتے اور چھال لے جایا کرتے ہیں۔ چند درخت پلکھن اور مولسری کے بھی ہیں۔ اصل گولڑ کے مرمریں حوض سے روضہ تک سطح زمین کی برابر سجادہ نشین صاحبان کے مزارات ہیں۔

عرس کی ابتدا ربیع الاول شریف کی چاند رات سے ہو جاتی ہے۔ بعد مغرب پنج درہ کے سامنے زائرین جمع ہوتے ہیں اور صاحب سجادہ کے ہمراہ شرقی دروازے سے کلیر میں ان کے مکان پہ پہنچتے ہیں۔ وہاں قوالی ہوتی ہے۔ جب زنان خانہ سے دو خوان آتے ہیں۔ سجادہ صاحب ایک خوان کو اپنے سر پہ رکھتے ہیں اور دوسرا ان کے فرزند اکبر کے سر کی زینت بنتا ہے۔ قوالی کے ساتھ یہ جلوس درگاہ تک جاتا ہے۔ راستہ میں بعض بزرگ

ان خوانوں کو باری باری اپنے سروں پہ لے لیتے ہیں۔ روضہ میں داخل ہو کر رسم منہدی ادا کی جاتی ہے اور فاتحہ کے بعد تبرک تقسیم کیا جاتا ہے۔ اصل عرس بارھویں ربیع الاول شریف کو ہوتا ہے۔ گیارھویں اور بارھویں شب میں روشنی کی جاتی ہے اور روضہ بقعۂ نُور بن جاتا ہے تیرھویں کی صبح کو دس بجے کے قریب قُل ہوتا ہے۔ چودھویں کو غسل ہوتا ہے۔ غسل کا گلاب اور پانی تبرک کے طور پہ زائرین لیتے ہیں۔ تیرھویں کو قل کے بعد اکثر صاحبان حضرت خواجہ بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے عرس میں شرکت کے لیے دہلی روانہ ہو جاتے ہیں اور وہاں چودھویں تاریخ کی صبح کو قل میں شرکت کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ کلیر میں اکثر زائرین عرس کی ابتدا سے کئی دن پہلے بھی آ جاتے ہیں اور بعد قل واپس جاتے ہیں۔ کچھ ہجوم ۲۰ تاریخ تک بھی رہتا ہے۔ جنگل میں منگل ہو جاتا ہے گویا چند دن کے لیے ایک خوشنما اور وسیع شہر زمین سے اُبل پڑتا ہے۔

نہر کے پُل سے شمالی دروازے تک دو رویہ دکانیں سجی بنی ہوتی ہیں۔ اور درگاہ کے چاروں طرف خیموں اور چھولداریوں کی آبادی ہو جاتی ہے۔ مسجد اور روضہ کے اندر قرآن خوانی ہوتی رہتی ہے۔ رات کے وقت مجاہدین نعروں اور ضربوں سے آسمان سر پہ اُٹھا لیتے ہیں مشہور قوال اپنے اپنے جوہر دکھاتے ہیں اور سامعین وجد میں آ کر ان کی جھولیاں بھر دیتے ہیں۔ قل یا ختم کے بعد صاحب سجادہ الائچی دانے لٹاتے ہیں۔ اس کے بعد رنگ گایا جاتا ہے اب بڑی مشکل سے بھیڑ کو چیرتے ہوئے پنج دروازہ دیوان خانہ میں جاتے ہیں۔ اسی روز بعد نماز ظہر صاحب سجادہ امام صاحب کے مزار پہ حاضر ہوتے ہیں۔ جیٹھ کے مہینے میں دو جمعراتیں شاندار طریقے سے منائی جاتی ہیں اور عرس کا سا منظر ہو جاتا ہے۔

روضہ کے اندر مزار شریف حجرے میں ہے۔ حجرے کی دیواریں سنگ مرمر کی ہیں اور فرش میں سنگ موسٰی اور مرمر کی آمیزش ہے۔ مزار کے چاروں طرف مرمریں کٹھہرا

ہے[1]۔ سب سے پہلے حضرت ترک پانی پتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مزار بنوایا تھا۔ امام صاحب کی درگاہ سے قلعہ کے ٹوٹے ہوئے دو پتھر لاکر رکھ دیئے تھے اور اوپر سے مٹی چڑھا دی تھی۔ عرصہ کے بعد ایک سنیاسی نے مزار میں شگاف کر دیا تھا تو مجاوروں نے مرمت کر دی تھی۔ ۹۳۷ھ میں شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مزار پختہ بنوایا تھا۔ لیکن ایک روایت یہ بھی ہے کہ ۹۳۳ھ میں پختہ مزار جہانگیر بادشاہ نے بنوایا تھا۔ اکبر بادشاہ کے عہد میں روضہ کی تعمیر از سر نو ۱۰۳۳ھ میں کی گئی تھی۔ بقول صاحب سیر الاقطاب جہانگیر نے بھی اس میں کچھ اضافہ کیا تھا۔ سو برس کے قریب ہوئے تو انگریزی سرکار نے احمد اللہ سب جج کی ہدایت میں کمیٹی کے ذریعہ مزار اور روضہ کی تعمیر کے متعلق تحقیق کروائی تھی۔ مولانا ظہیر العلماء سہسوانی نے اپنی کتاب "حیات صابریہ" میں اس کمیٹی کی رپورٹ کا خلاصہ لکھا تھا۔ یہ کتاب ملک چنن الدین کے لاہوری پریس سے شائع کی گئی تھی۔ مگر اب اس کا پتہ نہیں چلتا۔ مزار کے حجرے کے چاروں طرف برآمدہ ہے اور سنگ مرمر کی جالیوں سے محدود ہے۔ اس کے ہر سمت آہنی کواڑ ہیں۔ عام طور پر آمد و رفت مشرق کے آہنی دروازے سے ہوتی ہے۔ حجرے کے دو دروازے شرق رویہ ہیں جن پر چاندی پتر منڈھی ہوئی ہے۔ ان میں سے جو دروازہ (معمرہ ۱۳۳۱ھ) مشرق و جنوب میں ہے اس سے مزار تک رسائی ہوتی ہے۔

احاطہ درگاہ بہت وسیع ہے۔ اس میں بیس تیس ہزار آدمی سما سکتے ہیں۔ احاطہ

---

[1] ۱۹۱۸ء میں بھوپال کی بیگم صاحبہ نے روضہ پر سنگ مرمر کا کام کروایا۔ مزار کے چاروں طرف میرٹھ کے نواب اسحاق خان صاحب نے مرمر و موسیٰ کا فرش لگوایا تھا۔ اندرونی پا انداز بابو گوری شنکر وکیل آگرہ نے سنگ مرمر و موسیٰ کا بنوایا۔ غلام گردش کے باہر جالی اور چہار دیواری جنرل عبید خاں بھوپال نے بنوائی۔ درگاہ کا فرش سنگ سرخ سے صاحب سجادہ عبدالرحیم صاحب نے مولوی عبدالرب ڈپٹی کلکٹر کی نگرانی میں بنوایا۔ مزار پر گل کاری بمبئی کے سیٹھ ابراہیم عرب نے کروائی۔

کے ہر سمت میں سہ دریاں ہیں۔ گوشہ شمال و مغرب میں شاندار مسجد ہے۔ بیگم صاحبہ بھوپال نے مسجد کے اندرونی حصہ کو وسیع بنوا دیا تھا۔ وضو کے لیے چبوترا پر ٹین کا سائبان ہے۔ سقاوہ ماسٹر امراؤ حسن قادری صابری نے بنوایا تھا۔ جانب شمال ٹیوب ویل ہے اور اس کنوئیں کے باہر کی طرف پانی کی ٹینکیاں ہیں۔ مسجد کے قریب سماع خانہ ہے درگاہ کے مغرب میں دیوان عبدالرحیم خاں صاحب کا باغ ہے اور اس میں کوٹھی بنی ہے۔ یہ باغ ۱۳۲۰ھ میں لگایا گیا تھا۔ شمالی دروازے کے شرقی جانب کی سہ دری مولانا شاہ عظمت علی صابری دیوبندی نے بنوائی تھی۔ عرس کے ایام میں یہاں لنگر تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس کے برابر ہی مشرق میں باورچی خانہ ہے۔ جنوبی دروازے سے نکلنے کے بعد ایک لمبا چبوترہ ہے اس میں مختلف مزار ہیں۔ یہاں ایک پنجابی بزرگ مرزا صاحب کا مزار ہے۔ یہ فنا فی الفرید تھے۔ انہوں نے پاک پٹن شریف سے آکر یہاں سکونت اختیار کر لی تھی۔ نام معلوم نہ ہو سکا۔ ان کی ایک ٹانگ کسی قدر چھوٹی تھی[1] اس چبوترا کے سامنے ہی ایک سہ دری ہے۔ احاطہ درگاہ کے اندر جنوبی و مغربی حصہ میں حضرت ضامن علی جلال آبادی رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ (متوفی ۱۲۹۶ھ) کا مزار ہے۔ یہاں کبوتر کثرت سے رہتے ہیں اور مشہور ہے کہ یہ کبوتر حضرت مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے زمانے کے ہیں۔ ضامن علی صاحب کی قبر کے مغرب میں دو پختہ مزار ہیں۔ یہ نواب بھمبو خان[2] کی ہمشیرہ اور اہلیہ کے ہیں۔ ان دونوں قبروں کے اور نواب بھمبو خان کی قبر جالی دار ہے ان نواب صاحب نے ۱۸۱۳ء میں سب سے پہلے درگاہ کی چار دیواری مع شرقی۔ جنوبی اور شمالی دروازوں کے بنوائی تھی۔ پھر

---

[1] مرزا صاحب احقر پر خاص کرم فرماتے تھے۔ دو تین مرتبہ میرے یہاں شیخوپور بھی آئے تھے۔

[2] نواب کا نام معین الدین خان تھا۔ روہیلہ تھے اور نجیب آباد ضلع بجنور کے رئیس اعظم تھے۔ حضرت مخدوم پاک کی دعا سے ان کے دو صاحبزادے محمود خان اور جلال الدین خان پیدا ہوئے تھے۔

سہ دریائی حجرے اور سماع خانہ کو بنوایا تھا۔ مشرقی دروازہ کے باہر جو احاطہ ہے وہ بھی ان کا ہی تعمیر کردہ ہے۔ مکاشفہ کے مطابق مسجد کے جنوب میں ایک اور حجرہ بنوایا تھا۔ اس حجرہ میں مشہور بزرگوں نے اعتکاف کیے ہیں۔ اعتکاف کرنیوالوں میں حضرت حاجی وارث علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔

نہر کے اس پل کے مشرق میں دو فرلانگ پر چالیس فٹ کی بلندی پر حضرت امام الدین دمشقی رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ ہے۔ یہ خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ ہیں۔ یہاں تبلیغ کیلئے بھیجے گئے تھے اور جنگ کلیر میں شہادت پائی تھی۔ مزار قلعہ کلیر کے برج پر واقع ہے۔ اس درگاہ کی چہار دیواری ڈھائی فٹ اونچی ہے۔ چبوترے پر مغرب میں جو حجرہ ہے اسی میں ان کا مزار ہے اور گوجر کی لڑکی کی بھی جسکا نام گوہر تھا۔ قبر اسی حجرے میں ہے۔ یہ لڑکی برضا عقیدت مسلمان ہو گئی تھی اور امام صاحب نے اسے اپنی دینی بہن بنالیا تھا۔ اردگرد سنگ سرخ کی بارہ دری ہے جو بی بی خورشید بیگم تعلقہ دار ساڈھورہ نے ۱۳۲۷ھ میں بنوائی تھی۔ یہاں کا منظر دلفریب اور خوشنما ہے۔ درگاہ کے مشرق میں مختصر سی آبادی ہے اسی کو کلیر کہتے ہیں یہاں ہی وہ مسجد ہونی چاہیے جس کے متعلق افواہ ہے کہ پانسو پالکی سوار جمعہ کی نماز پڑھنے آتے تھے اور جس کو مخدوم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے شہید کر دیا۔ اسی سمت میں لب نہر خام راستہ پر پیر غیب کا مزار ہے جو معدوم ہو گیا تھا مگر جب نہر جاری ہوئی تو پانی نے اس جگہ پہنچ کر ٹھوکر کھائی اور آگے بہنے سے انکار کر دیا۔ نہر کے انجنیئر کاٹلے صاحب کو بشارت ہوئی کہ مزار بنوا دو تو پانی آگے کو بڑھے گا۔[1] چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس مزار کے جنوب میں ایک فرلانگ پر کلکلی رحمۃ اللہ علیہ

۱؎ نہر ۱۸۳۹ء میں نکالی گئی تھی۔ جب پانی پہلی مرتبہ چھوڑا گیا تو آگے آگے گھوڑے پر انجنیئر صاحب دونوں طرف روپیہ کی بوچھاڑ کرتے ہوئے رواں دواں تھے اور ان کے پیچھے پیچھے پانی چلتا تھا۔ کسی شاعر کے قصیدہ کا ایک مصرع یہ ہے۔

کاٹلے صاحب نے گنگا کاٹ لی

کا مزار ہے اور اس کے قریب مسجد ہے یہ صاحب بھی جنگ کلیر میں شہید ہوئے تھے۔

دیوان صاحب کے باغ کی جانب نصف فرلانگ پر علیم اللہ ابدال کا مزار ہے ان ابدال صاحب کے مزار سے آگے بڑھ کر ایک سرحدی بزرگ مقیم ہیں۔ اپنے مرشد کا فوٹو آنکھوں کے سامنے رکھتے ہیں پہلے یہ درگاہ میں مقیم تھے۔ سجادہ صاحب سے نزاع ہو جانے پر اس جگہ رہنے لگے ہیں۔ ان کے معتقدین نے کچھ زمین بھی انہیں ہبہ کر دی ہے جس میں انہوں نے باغ لگا دیا ہے اور کنواں بھی بنوا دیا ہے۔ عرصہ کا یہ ذکر ہے۔ اب پتہ نہیں ان کے کیا احوال ہیں یا کیا حشر ہوا۔

عرس میں پنجاب کے زائرین بہت آتے تھے لیکن تقسیم ہند کے بعد پاسپورٹ اور ویزا کے کہ کم تعداد آتی ہے۔ لیکن عرس کی رونق میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔

الٰہی آفتاب چشتیاں رخشندہ بادا



صابری سجادہ نشین

(۱) **حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ** سنہ ۸۶۰ھ/۱۴۲۳ء تا سنہ ۹۴۴ھ/۱۵۲۶ء ان کی شادی حضرت عارف رحمۃ اللہ علیہ کی صاحبزادی سے ہوئی۔ ردولی میں ۳۵ سال مجاہدات کئے۔ ۳۵ سال شاہ آباد ضلع انبالہ میں گزارے باقی ۱۴ سال گنگوہ میں کٹے۔

(۲) **شیخ عبدالحمید** سنہ تا سنہ ۱۵۵۲ء کلیر اور گنگوہ دونوں سجادوں پر متمکن رہے یہ بڑے صاحبزادے تھے اور پیدائش ردولی میں ہوئی تھی۔

(۳) **شیخ عبدالصمد** سنہ تا سنہ ۱۵۸۲ء کلیر اور گنگوہ کے سجادہ پر رہے۔

(۴) **شیخ فتح اللہ** سنہ تا سنہ ۱۶۱۳ء ان کے زمانہ میں کلیر اور گنگوہ کے سجادے علیحدہ ہو گئے

(۵) **شیخ محمد صادق** سنہ تا سنہ ۱۶۱۴ء یہ محض کلیر کے صاحب سجادہ تھے اور شیخ ابوسعید گنگوہی کے بھتیجے اور خلیفہ تھے۔ بافیض بزرگ تھے شاہجہان کے عہد میں سنہ ۱۰۵۸ھ/۱۶۴۰ء میں انتقال ہوا۔

(۶) **شیخ محمد** سنہ تا سنہ ۱۶۵۶ء کلیر کے سجادہ نشین تھے۔ صابری مسجد انہوں نے بنوائی اب اس کے آثار باقی ہیں اور روضہ کی بھی مرمت کروائی۔

سنہ تا ۱۷۱۰ء شاہجہان نے موضع کلیر وقف

(۷) **شیخ احمد عرف شاہ بڑے** کیا اور اورنگ زیب نے اس وقف میں بارہ مواضعات کا اضافہ کیا۔ اس شرط پہ کہ مطیع رہیں گے سَو بگھہ زمین کا اقرار نامہ مجاوروں کے نام لکھ دیا تھا۔

سنہ تا ۱۷۶۲ء ، ۱۷۵۹ء میں قرار پایا کہ چڑھاوے کے موٹے

(۸) **شاہ علی رضا** کپڑے اور پیسے مجاوروں کو دیئے جائیں باقی سب چڑھاوا صاحب سجادہ کا حصہ ہوگا۔

تا ۱۸۰۷ء ______

(۹) **شیخ احسان علی** روضہ کے پاس ان کا مزار سنگ مرمر کا ہے۔

تا ۱۸۳۵ء یہ جوالہ پور میں رہتے تھے۔ ان کے زمانہ میں

(۱۰) **شاہ علی بخش** نواب جھمبو خان نے عمارتیں ۱۲۳۱ھ / ۱۸۱۶ء میں بنوائیں۔

تا ۱۸۵۵ء سال بھر کے بعد مجذوب ہوگئے تو ان کے صاحبزادے

(۱۱) **شاہ نیاز علی** کے بالغ ہونے تک ان کے بھائی محمد حسین نے نیابت کی۔ اور ۱۸۹۱ء میں چڑھاوے کے متعلق مجاوروں سے مقدمہ بازی شروع ہوئی۔

تا ۱۸۹۹ء قیام جوالہ پور میں رہتا تھا۔ صرف جمعرات کو درگاہ میں

(۱۲) **شاہ ابوالحسن** آتے تھے۔ درگاہ پر مجاوروں نے قبضہ کر لیا تھا۔ غدر کے بعد ملکہ وکٹوریہ کے زمانہ میں اوقاف کی جانچ پڑتال کی گئی تو انہوں نے بارہ مواضعات کا فرمان چھپا لیا اس خیال سے کہ ضبط نہ کر لیا جائے اور محض کلیر کے وقف کا فرمان پیش کیا۔ چنانچہ وہی بحال رہا۔ موضع منسوب پور پر مجاور قابض ہو گئے تھے اور انہوں

نے اس موضع کو فروخت کر دیا تھا۔ ایک آم کے درخت پر مجاوروں سے مقدمہ ہوا۔ سجادہ صاحب کی ڈگری ہوئی اور اس کا معاوضہ مبلغ چالیس روپے دلوا دیا گیا۔

تا ۱۹۰۳ء درگاہ کے متعلق مجاوروں سے جو مقدمہ بازی ہوئی

(۱۳) **شاہ ظہور الحسن** تھی تو حکم مجاوروں کے خلاف ہوا اور سجادہ کو کامیابی ہوئی۔ کامیاب ہونے پر مجاوروں کو درگاہ میں آنے کی ممانعت کر دی۔ اس دشمنی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجاوروں نے انہیں قتل کر دیا۔

تا سنہ ء سرکار پرست تھے اور گورنر صوبہ لارڈ

(۱۴) **خان بہادر شاہ عبدالرحیم** میٹن کے منظورِ نظر تھے۔ انہوں نے درگاہ اور اس کے فرش میں بھی وسعت دی رڑکی سے درگاہ تک پختہ سڑک بنوائی۔ ۱۹۴۷ء میں خان بہادری کا خطاب دیا گیا۔ آنریری مجسٹریٹ بھی بنے اور ۱۹۴۸ء میں بجلی کی روشنی بھی کروائی۔

۱۹۷۶ء تک بحمداللہ بقیدِ حیات ہیں

(۱۵) **شاہ مسعود احمد عرف اکھن میاں** ان کی شادی ردولی شریف کے صاحب سجادہ کی صاحبزادی سے ہوئی ہے۔ عربی کے علاوہ انگریزی کی بھی تعلیم ہے۔

صابری خانقاہیں

۱- خانقاہ پانی پت : - شاہ عبدالحق پاکستان چلے گئے۔ اب ان کے جانشین شفاءاللہ صاحب ہیں۔

۲- خانقاہ تھانیسر : - جمیل احمد صاحب پاکستان کو ہجرت کر گئے۔

۳- درگاہ شیخ محب اللہ رحمۃ اللہ علیہ محلہ دریا گنج الہ آباد مہتمم مولوی عبداللہ صاحب

۴- خانقاہ شاہ عبدالجلیل رحمۃ اللہ علیہ دریا گنج الہ آباد مہتمم محمد میاں صاحب سابق ایم - ایل - اے

۵- درگاہ شاہ عضدالدین رحمۃ اللہ علیہ امروہہ۔ سجادہ نشین حضرت بابو میاں صاحب

۶- درگاہ شاہ عبدالباری رحمۃ اللہ علیہ امروہہ - سجادہ نشین حکیم محمد اسلام الحق صاحب

۷- درگاہ بابا فریدی رجب پور مراد آباد۔

۸- درگاہ ریاست رامپور - سجادہ نشین شاہ فضل حسین صابری صاحب

۹- درگاہ قادری باغ - ڈبائی ضلع بلند شہر - صاحب سجادہ محبوب علی صاحب

۱۰- درگاہ پیر لپور ڈاکخانہ کلیر شریف - صاحب سجادہ چراغ علی شاہ صاحب

۱۱- درگاہ حافظ لطافت علی - دیوبند، صاحب سجادہ - حکیم محمد معظم صاحب۔

۱۲- درگاہ حاجی عظمت علی شاہ، محلہ محل دیوبند، شاہ محمد طاہر صاحب

۱۳- درگاہ پیر محمد مجرانہ مظفر نگر، شاہ اظہار احمد صاحب

۱۴- " حضرت ابوالمعالی، انبیٹہ سہارنپور ، شاہ مودود علی صاحب پاکستان چلے گئے۔

۱۵- " سید ابراہیم رامپور منہاران سہارنپور، شاہ عزیز حسین صاحب

۱۶- " شاہ خاموش، حیدرآباد دکن، شاہ قطب الدین صاحب

۱۷- " شاہ محمد حسن صاحب حقیقت گلزار صابری، ریاست رامپور بلن میاں ملک صاحب

۱۸- " صابریہ - دریا گنج دہلی، سید نادر حسین صاحب

۱۹- " انعام الرحمٰن قدوس، محلہ شاہ بہلول، عطاء الرحمٰن صاحب

۲۰- " شیخ العالم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ردولی شریف بارہ بنکی شاہ آفاق احمد صاحب

۲۱- " گھیرے والے میاں صاحب، گھیرہ ضلع پیلی بھیت شاہ فدا حسین صاحب

۲۲- " شاہ سلیمان صاحب، پھلواری شریف پٹنہ، خواجہ حسنین سلمان صاحب

۲۳ " خانقاہ صابری، پیلی بھیت ـــــ صوفی انور علی صاحب۔



کتابیات

فوائد الفواد

سیر الاولیاء

راحت القلوب

خیر المجالس

سیر العارفین

اقتباس الانوار

گلزار ابرار

مراۃ الاسرار

جواہر فریدی

حقیقت گلزار صابری

اسرار عترت فریدی

خزینۃ الاصفیاء

اخبار الاخیار

تاریخ مشائخ چشت جلد پنجم

سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات

سوانح خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ

مکتوبات قدوسی

نظام تعلیم و تربیت

رسالہ اردو کراچی بابت اکتوبر سنہ ۶۷ء

انوار العاشقین

انوار العیون

در مکنون

تاریخ ہند